**NOVEMBER 2026**

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

# بیاض

لاہور

علامہ محمد اقبال
November 09

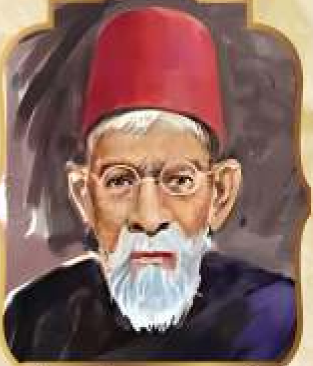

اکبر الہ آبادی
November 16

## سالگرہ مبارک

بانو قدسیہ
November 28

احمد ندیم قاسمی
November 20

عارف معین بلے
November 28

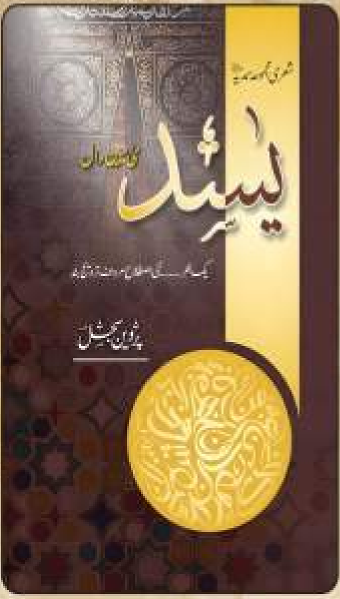

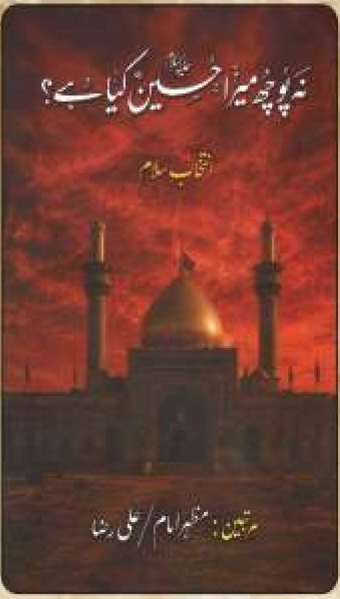
نہ پوچھ میرا حسینؑ کیا ہے؟
انتخابِ سلام
مرتبین: منظر امام / علی رضا

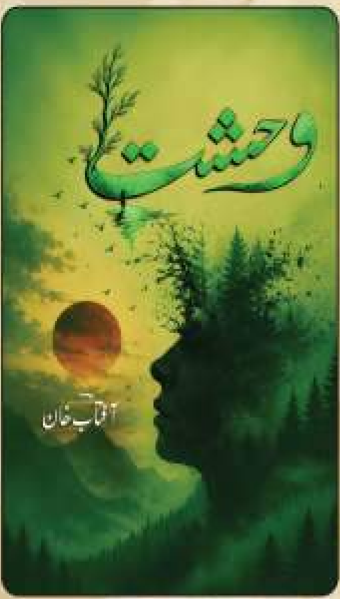
وحشت
آفتاب خان

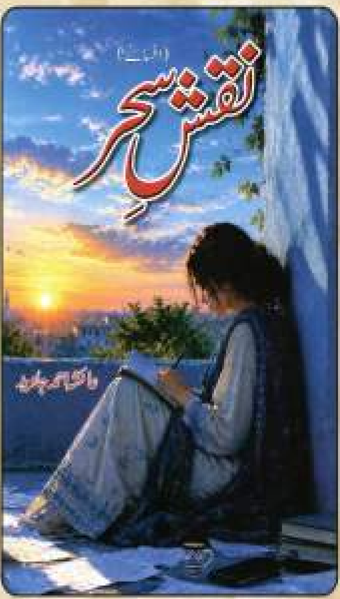
نقشِ سحر

## بانی مدیر: خالد احمد

# کرشمہ

یہ جہان آب و گل ہے ، تری ذات کا کرشمہ
پس علم و آگہی ہے ، تری بات کا کرشمہ
یہ کمال انتہا ہے ؟ کہ جمال ارتقاء ہے؟
گل صبح کی مہک ہے ، تری رات کا کرشمہ
مجھے کیا دکھا رہا ہے؟ مجھے کیا سکھا رہا ہے؟
یہ نظام دام و دانہ ، یہ حیات کا کرشمہ

خالد احمد

# We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

## THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

**We are a different organization in Pakistan**

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 37033901-9
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5252311 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

# ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 34 - نومبر 2026 - شمارہ نمبر: 11

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور



| مجلس ادارت | اعجاز رضوی | نوید صادق | کنور امتیاز احمد | جاہد احمد |
|---|---|---|---|---|



تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: جناب اکبر الٰہ آبادی، علامہ محمد اقبال، جناب احمد ندیم قاسمی
محترمہ بانو قدسیہ، جناب عارف معین بلے

قیمت: 150 روپے

سالانہ زر اعانت 1500 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز



سید اطہر شہید روڈ 16 کلو میٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com



ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹرز فارمیٹ ماڈل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

# اشاریہ


| نمبر شمار | عنوان | مصنف / مصنفہ | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| 1 | حمد | محمد انیس انصاری، محمد افضال انجم، سرور حسین نقشبندی | 7 تا 9 |
| 2 | نعت | سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، رضا اللہ حیدر عقیل رحمانی، علی محمد فرشی، اکرم ناصر، اشرف نقوی، احمد جلیل ذکی طارق، عاصم بخاری، افتخار الحق | 10 تا 20 |
| 3 | عقیدت | مرزا آصف رسول، ریاض ندیم نیازی | 21 تا 23 |
| 4 | رباعیات | سعید اشعر، محمد نصیر زندہ | 24 تا 25 |
| 5 | ہائیکو | آفتاب خان | 26 |
| 6 | افسانے | محمد حمید شاہد، حامد یزدانی، صغیر احمد صغیر فصیحہ آصف خان، شکیل احمد خان، عامر عباس ناصر اعوان شاہ روم خان ولی، نعمان منظور | 27 تا 84 |
| 7 | غزلیں | خالد احمد، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، اعجاز کنور راجہ خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، اسلام عظمی، راحت سرحدی قیوم طاہر، باقی احمد پوری، گلزار بخاری، شوکت محمود شوکت افتخار شاہد، احمد جلیل، اکرم ناصر، رضا اللہ حیدر، مسعود احمد | 85 تا 147 |

| نمبر شمار | عنوان | مصنف / مصنفہ | صفحہ نمبر |
|---|---|---|---|
| 7 | غزلیں | جمشید چشتی، رخشندہ نوید، سعد اللہ شاہ، اشرف نقوی، افروز رضوی<br>راجا نیر، شبہ طراز، محمد سلیم ساگر، اکرم سحر فارانی، شہزاد نیر<br>اقبال سروبہ، نجیل احمد نبیل، سمیع اللہ عرفی، ہمایوں پرویز شاہد<br>خالدہ انور، اعجاز روشن، ابو طالب انیم، محمد نوید مرزا، اعجاز دانش<br>افتخار الحق، ارشد محمود ارشد، علی حسین عابدی، عون الحسن غازی<br>صغیر احمد صغیر، سرور فرحان، فیض رسول فیضان، نائلہ راٹھور<br>اکرم جاذب، افضل ہزاروی، اصغر علی بلوچ، ظہور چوہان<br>علمدار حسین، میتھیو محسن، محمد افضال انجم، اسد رضا سحر، شبیر نازش<br>فیاض تحسین، الماس شبی، عاصم بخاری، غنی الرحمٰن انجم، محمد دلشاد رانا<br>کاشف افضل، جعفر علی جعفر، کوکی گل، کرن کومل، نوید صادق | 85<br>تا<br>147 |
| 8 | مضامین | جلیل عالی، خاور اعجاز، نسیم سحر، سلمیٰ اعوان، جمیل احمد عدیل<br>احمد رضوان، رانا خالد محمود قیصر، ارشد محمود ارشد، ظہیر گیلانی<br>طارق جاوید، انعام الحسن کاشمیری، شاعر علی شاعر، شاہد اشرف | 148<br>تا<br>209 |
| 9 | طنز و مزاح خاکہ | اعجاز رضوی | 210 تا 213 |
| 10 | نظمیں | خالد احمد، جلیل عالی، گلزار بخاری، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری<br>سید افسر ساجد، علی محمد فرشی، طالب انصاری، جمشید چشتی<br>رخشندہ نوید، طلعت شبیر، علی رضا احمد، تنویر قاضی، دردانہ نوشین خان<br>راجا نیر، سمیع اللہ عرفی، محمد اشفاق بیگ، امجد بابر<br>محمد افتخار شفیع، انوار انجم، شبیر آکاش، نائلہ راٹھور، کومل شہزادی<br>ذوبین احمد، محمد عبداللہ، نگہت اکرم | 214<br>تا<br>241 |
| | | | |

# حمد

سانسوں کے خَم و پیچ میں آباد ہے، رحمان
سینے میں ہر اک لحظہ تری یاد ہے رحمان!

میں جو بھی ہوں، جیسا بھی ہوں، جتنا بھی بُرا ہوں
"ایمان" میری زیست کی بنیاد ہے رحمان!

دیتا ہے مُسلسل مجھے تیری ہی بشارت
مجھ میں یہ کوئی میرا ہی ہم زاد ہے، رحمان!

ہر شہر غزہ بنتا چلا جاتا ہے میرا
تو بھیج ابابیل، یہ فریاد ہے، رحمان!

تنکوں کی طرح ملّتِ اسلامیہ ہے آج
یک جان، فقط باطل و اِلحاد ہے، رحمان!

ہم سب، تری بخشش کے طلب گار، سرِ حشر
اولاد ہے، ماں باپ ہیں، اَجداد ہیں، رحمان!

سرکارِ دو عالم کی شفاعت کا یقیں ہے
ہم پُرسشِ اعمال سے آزاد ہیں، رحمان!

ہم لاکھ گنہگار ہیں باغی نہیں تیرے
ہم لوگ ترے تابعِ ارشاد ہیں، رحمان

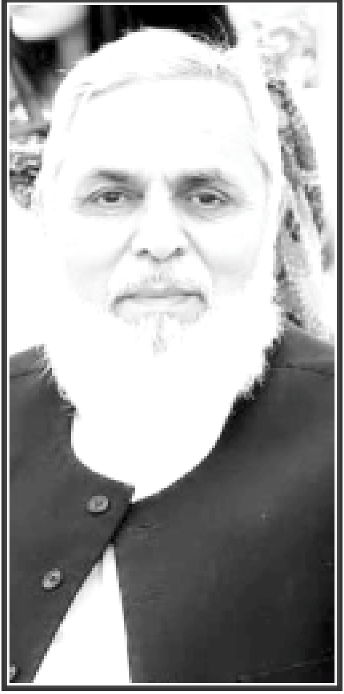

محمد انیس انصاری

# حمد

مرا حسن تو ہے جمال تو
تو ہنر مرا ہے کمال تو
نہیں تجھ سا کوئی ، نہ ہے ، نہ ہو
نہیں جس کی کوئی مثال تو

نہیں جس کا کوئی جواب ہی
اے خدا ہے ایسا سوال تو
ہے ازل سے تا بہ ابد تُجھی
وہ نہیں ہے جس کو زوال تو

مری زندگی تری بندگی
مجھے اپنی راہ پہ ڈال تو
میں ہوں مشکلوں میں گھرا ہوا
مجھے آپ ان سے نکال تو

مرا فقر و مستی بھی تجھ سے ہے
مرا زر بھی تو مرا مال تو

میں نہ بھولوں عیش و نشاط میں
غم و حزن میں مری ڈھال تو

میں پکاروں تجھ کو ہی ہر گھڑی
مرا حال تو مرا قال تو

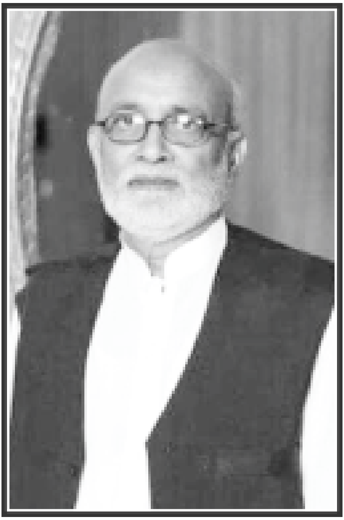

محمد افضال انجم

# حمد

مرے سخن پہ ہو پیہم عطا تو چاہے
ہرا رہے مرا نخلِ ثنا جو تو چاہے

خیال و حرف پہ تازہ گلوں کا موسم ہو
مہک اٹھیں سبھی حرف و نوا جو تو چاہے

روئیں روئیں کو ہو ازبر الست بربکم
نفس نفس میں ہو قالوا بلیٰ جو تو چاہے

بیان و حرف میں تاثیر ہے تری بخشش
اثر پذیر ہوں نطق و نوا جو تو چاہے

تو اپنی شان کے شایاں کریم ہے مولا
مٹیں سبھی مرے جرم و خطا جو تو چاہے

ترے کرم سے چٹانوں میں پھول کھلتے ہیں
یہ مشتِ خاک بھی ہو کیمیا جو تو چاہے

بغیر اذن تری حمد ہو نہیں سکتی
مرے لبوں پہ ہو تیری ثنا جو تو چاہے

تو رب کن فیکون اور یہ بے نوا سرور
دوام پائے یہ لکھا ہوا جو تو چاہے

سرور حسین نقشبندی

# نعتؐ

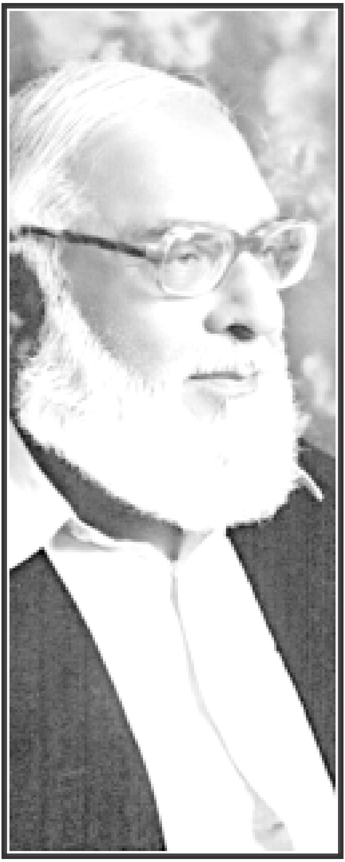

بختِ خاور کو ملا سرِّ شعورِ زندگی
ہم نے سیکھا ہے نبیؐ سے ہی سرورِ زندگی

مہر و ماہ مصطفیؐ سے ہم منور ہو گئے
ہاتھ آئی ہے اسی صورت ہمیں تابندگی

پیروئ اسوۂ خیرالبشر کا فیض ہے
احترامِ آدمیت سے ملی پائندگی

رہنمائی خوب کی ہے ورنہ پہلے آپؐ سے
ہر سفر بے سمت تھا، ہر گام تھی شرمندگی

ہے درخشاں آپؐ سے ہی خوابِ خوش اب تک ریاضؔ
اب کہاں اوہام، اب تو ہے یہاں رخشندگی

**سید ریاض حسین زیدی**

چہرہ تمام رنگ تھا، پیکر کرن تمام
گہنا کے رہ گئے مہ و پروین تن تمام

---------- انتخاب ----------

**- خالد احمد -**

------- نعمان منظور -------

# نعتؐ

محمدؐ مصطفیٰ صلِ علیٰ کے در سے ملتا ہے
قرارِ زندگانی لطفِ پیغمبرؐ سے ملتا ہے"

اُجالا کہکشاں، شمس و قمر کو اور زمینوں کو
انہی کے نوری مخزن، نور کے پیکر سے ملتا ہے

رسولِ پاکؐ سے قربت کی شدت کا کچھ اندازہ
مرے اندر سے ملتا ہے، مرے باہر سے ملتا ہے

خدائے پاک نے محبوبؐ کو رتبہ دیا کیسا!
بشر کو جو بھی ملتا ہے اُنہیؐ کے در سے ملتا ہے

پیالہ خوش نصیبوں کو عطا ہو جو مدینے میں
حقیقت میں وہ سرچشمۂ کوثر سے ملتا ہے

پڑھو ہر دم درود اُن پر، ثناء اُن پر ثنا خوانو
کہ اعزازِ ثنا خوانی انہیؐ کے در سے ملتا ہے

نہیں رہتا ہے تاریکی کا نام و نشاں کوئی
کرن کا جھپکا جس دم روضۂ انور سے ملتا ہے

خدائے پاک کی اُن پر عطا کا کچھ تو اندازہ
ہمیں چلتے شجر سے، بولتے پتھر سے ملتا ہے

سبق بھولے تو پھر ہم نے زوال آمادگی دیکھی
ہمارا پیش منظر کیسے پس منظر سے ملتا ہے!

کبھی تھا تین سو تیرہ، کبھی جو بس بہتر تھا
ہمارا سلسلہ ایسے جری لشکر سے ملتا ہے

نسیم سحر

# نعتؐ

یقیناً عشق کا جذبہ ہمارے کام آئے گا
محمدؐ کے غلاموں میں ہمارا نام آئے گا

ارے دُکھ درد کے مارو، پڑھو نغمے درودوں کے
بہت تسکین پاؤ گے، بہت آرام آئے گا

گیا پردے میں سورج ہو گئیں بے نُور سی آنکھیں
فلک سے پھر کبھی ایسا نہ کچھ انعام آئے گا

تو سمجھیں گے کہ فضلِ رب سے ساری نعمتیں آئیں
ہمارے ہاتھ میں کوثر کا جس دن جام آئے گا

مرے اشکوں نے پھر سے حاضری کی التجا کر دی
مدینے سے، رضا تم دیکھنا، پیغام آئے گا

رضا اللہ حیدر

---

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

سلسلے بند کیے، مہر لگا دی تو نے
صفحۂ ارض پہ اک آخری اُمت لکھی

# نعتؐ

جب لکھو تو نبیؐ کی نعت لکھو
گر ہو شاعر تو اُن کی بات لکھو

جب پڑھو آپؐ پر درود پڑھو
جب لکھو آپؐ کی صفات لکھو

نور جالی کا آنکھ میں بھرلو
دل میں ہو گی کبھی نہ رات لکھو

جب شفاعت حضورؐ کر دیں گے
ہو گی دوزخ سے تب نجات لکھو

بول ان کے خدا کے بول ہوئے
انکے ہاتھوں کو رب کے ہات لکھو

جو بھی اُنؐ پہ درود پڑھتا ہے
آپؐ رہتے ہیں اسکے ساتھ لکھو

پل مدینے میں جو گزر جائیں
صرف اُنکو ہی آب حیات لکھو

اُنؐ کی خاطر نظام سارا بنا
اُنؐ سے چلتی ہے کائنات لکھو

دل مدینہ ہو روح جسکی نجف
اسکو ہو گی کبھی نہ مات لکھو

ہائے طیبہ سے واپسی کا سفر
دل پہ گزری جو واردات لکھو

اُنؐ کا رتبہ عقیل سب سے بڑا
اُنؐ کے قبضے میں شش جہات لکھو

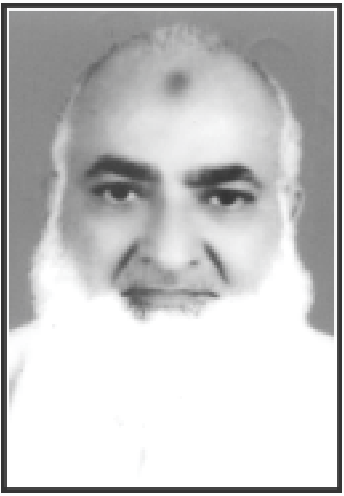

عقیل رحمانی

## نعتیہ نظم (مری معراج مدینے کا عرش ہے)

مرے مولا!
ہزاروں سال کی نوری مسافت پر
شب اسریٰ کے اسرارِ حریری
اوڑھ کر بیٹھا ہوا ہوں میں
مدینے کی طرف دو پاؤں چلتا ہوں تو
گر پڑتا ہوں
نوری فاصلے مٹی سے طے کرنے نہیں ممکن!

مرے مولا!
شب اسریٰ کے اسرارِ صعودی کھولنے والے!
ہزاروں سال کی نوری مسافت کو
پلک بھر میں
زمیں کو آسماں سے جوڑنے والے!
مدینے کے لیے
کعبے کی قربت چھوڑنے والے!

مرے مولا!
ہزاروں سال کی نوری مسافت پر
شب ہجرت کی خواہش کے
کنارے پر کھڑا ہوں میں
شب اسریٰ کے
اک روشن ستارے کے
شرارے پر کھڑا ہوں
آپ کی رحمت کی ابرو کے اشارے کے
سہارے پر کھڑا ہوں میں!

**علی محمد فرشی**

# نعتؐ

ہے یاں بخشش یقینی اس یقیں پر بیٹھ جاتے ہیں
مدینہ کی زمیں ہے تو کہیں پر بیٹھ جاتے ہیں

گوارہ تھا نہیں مٹی پہ جن کو پاؤں بھی رکھنا
عقیدت سے وہ طیبہ کی زمیں پر بیٹھ جاتے ہیں

ہم ان کی بزم میں حاضر ہیں یہ اعزاز کیا کم ہے
جہاں بھی جا ملے جس کو، وہیں پر بیٹھ جاتے ہیں

نوافل باغ جنت میں ادا کر کے نکلتے ہیں
تو ہم مسجد کے فرش دل نشیں پر بیٹھ جاتے ہیں

یہاں سے گر نظر آتا ہے تم کو روضۂ اطہر
دل مضطر چلو پھر ہم یہیں پر بیٹھ جاتے ہیں

دلائل سنتے ہیں ختم نبوت کے وہ محفل میں
منافق ہیں، یقیں کرتے نہیں، پر بیٹھ جاتے ہیں

تھی ہجرت بھی ضروری اور امانت کا بھی لوٹانا
علی پھر مسند صادق امیں پر بیٹھ جاتے ہیں

اکرم ناصر

# نعتؐ

جب سے ملا ہے آپؐ سا آئینہ گر ہمیں
ملنے لگی ہے اپنی بھی خیر و خبر ہمیں

ہو نعت کے وسیلے سے طرزِ سخن عطا
چشمِ کرم سے اپنی، کریں باہُنر ہمیں

پڑھ کر درود آقاؐ پہ، دستک جو دیں گے ہم
دیوار خود دکھائے گی رحمت کا در ہمیں

ہم تو حضور ورنہ تھے خاشاک کی طرح
نسبت نے آپؐ ہی کی کیا معتبر ہمیں

اپنا لیں ہم جو آپؐ کی سیرت کا راستہ
بھٹکا سکیں گے کیسے بھلا اہلِ شر ہمیں

عشقِ نبیؐ میں کچھ بھی نہ اپنی رہے خبر
ویسے بھی لوگ کہتے ہیں آشفتہ سر ہمیں

ملتا اگر نہ احمدِ مرسلؐ کا آسرا
دنیا تو کرنے والی تھی زیر و زبر ہمیں

گزریں ہزاروں مرتبہ باب السلام سے
درپیش ہو مدینے کا اتنا سفر ہمیں

تکنا پڑے کبھی نہ کسی غیر کی طرف
رکھیے حضورؐ اپنے ہی زیرِ اثر ہمیں

رکھتے نہیں ہیں اہلِ زمانہ سے خوفِ یم
ایسا مدینے والا ملا چارہ گر ہمیں

اشرف کچھ ان کے واسطے مشکل تو ہے نہیں
در پہ بلا کے رکھ لیں جو خیر البشر ہمیں

اشرف نقوی

# نعتؐ

مرے راستوں میں جو روشنی کی دھمال ہے
رُخِ مصطفٰے کے جمال کا یہ کمال ہے

نہیں ملتی کوئی نظیر خلقِ عظیم کی
شہِ دو جہاں ترا اسوہ اپنی مثال ہے

جو بلالی روح کے ذوق سے ہے تہی تہی
بڑی کسمپرسی میں اب وہ رسمِ بلال ہے

تو نے خیر ورشد کے راستے جو دکھا دیے
انہیں منزلوں کا قدم قدم پہ خیال ہے

سرِ حشر اُن کی شفاعتوں کا ہوں منتظر
مری معصیت کا جلیلؔ اُن کو خیال ہے

**احمد جلیل**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

حُسن آخر نے کیا حُسن کو آخر تجھ پر
آخری رُوپ دیا ، آخری صُورت لکھی

# نعتؐ

پھر کسی صورت نہ بہلا اس طرح مچلا کہ بس
دل میں دیدارِ مدینہ کا وہ درد اٹھا کہ بس

صرف اک پل کے کرم سے بھر گیا دامن مرا
اور مجھ پر ابرِ رحمت اس قدر برسا کہ بس

ان کے در پر حاضری کی دیکھ کر میری تڑپ
دل سے ہر نقشِ تمنا مٹ چلا ایسا کہ بس

منکرِ سنت کا دیکھا خواب میں انجام جو
چونک کر میں نیند سے کچھ اس طرح جاگا کہ بس

ایک لمحے کو ملا جو سبز گنبد کا سکون
زندگی سے ہر الم کچھ اس طرح بھاگا کہ بس

جب تصور میں مدینے کی وہ گلیاں آ گئیں
دل کا ہر ارمان یوں آنکھوں سے بہہ نکلا کہ بس

یادِ سرکارِ دو عالم جب غموں میں آئی ہے
اشک بن کر آہ اس شدت سے دل پگھلا کہ بس

جب گناہوں کی گواہی دیتے چیخا سارا جسم
میرے ایماں کی بتاتے بول اُٹھے آقا کہ بس

جالیوں کو چومنے کی آرزو میں عمر بھر
مضطرب دل میرا کچھ اس طرح سے دھڑکا کہ بس

جب کبھی اعمال کا اپنے لیا ہے جائزہ
لگ گیا مجھ کو وہ خوفِ حشر کا دھڑکا کہ بس

جیسے ہی نامِ محمدؐ آیا ہونٹوں پر ذکی
میری تکلیفوں کے دن کچھ یوں ہوئے چلتا کہ بس

ذکی طارق

# نعتؐ

نبیوں کے سردار نبی خاتم میرے
حق سچ کا پرچار نبی خاتم میرے

بچے بوڑھے مرد خواتیں من جملہ
ہر اک کے غم خوار نبی خاتم میرے

دل دہلائے کفر کے سب ایوانوں میں
ایسی اک للکار نبی خاتم میرے

جن کی آمد چین کا باعث دنیا میں
ہر اک کے دل دار نبی خاتم میرے

سر پر جن کے تاج رسالت سجتا ہے
ہاں وہ ہی سالار نبی خاتم میرے

عملاً صادق اور امیں ہے منوایا
ایسا اک کردار نبی خاتم میرے

جن کا عاصم خلق مثالی دنیا میں
ایسے خوش گفتار نبی خاتم میرے

**عاصم بخاری**

# نعتؐ

معراج اس سوال کا پورا جواب ہے
ذاتِ محمدؐ ایک مکمل کتاب ہے

سب انبیا پڑھاتے رہے تھے کتب مگر
اُمّی نے جس کا درس دیا الکتاب ہے

رب نے زمیں پہ جو بھی اتاری کتاب ہے
اس میں ضرور ذکرِ رسالت مآب ہے

والفجر میں ہے عہدِ حلیمہ کا تذکرہ
والشمس میں بیانِ مطہر شباب ہے

رہتا ہے عرش ورد میں مصروف ہر گھڑی
اور ارض پہ بھی ذکر ترا بے حساب ہے

قوسین اک مثالِ قرابت ہے آپ کی
ہر ذی نفس سے رب کا وگرنہ حجاب ہے

عرفات یومِ حشر کو بن جائے گا گواہ
منشور اس جہان کا تیرا خطاب ہے

کس طرح سایہ آپ کا بنتا زمین پر
سارا جہان آپ کے آگے سراب ہے

جس دل میں رب کے ساتھ ہو ذکرِ نبیؐ سدا
مجبور دور رہنے پہ اس سے عذاب ہے

افتخار الحق

# عقیدت

صل علیٰ کی ہے ضیا مدحت خاتم الرسل
صل علیٰ سے جان فزا الفت خاتم الرسل
صل علیٰ نبینا صل علیٰ محمد
قصد ثناء و التجا قربت خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا کیوں ہو دل اضطراب میں؟
حاضر و ناظر آنحضور ہیں کہ ہیں وہ غیاب میں؟
وہ تو ہیں شاہد ابد، اب بھی ہے الکتاب میں
عشق نواز و دل کشا محبت خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا وہ کہ ہیں جانِ دو جہاں
رونق بزم کن فکاں، ان پہ فدا ہر آسماں
اُن پہ ہی صرف ہے عیاں کیا ہے مکان ولامکاں
ظن و یقین سے ماورا رفعت خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا ساتھ ہیں ہر طلب کہ وہ
اُن کا عجم پہ بھی کرم، کب ہیں فقط عرب کے وہ؟
علم و عمل بھی جسم و جاں بھی جس سے ہوں سیر سب کے وہ
آپ طہور، تزکیہ دعوتِ خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا وہ ہیں امیں وہی اماں
لمحہ بہ لمحہ موجزن وقت کا بحرِ بے کراں
کہتا ہے اپنی لہر میں اے دلِ حزنِ این و آں
زیست ہے ناؤ، ناخدا رحمت خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا ساری رسالتیں لیے
حشر و حساب کی تمام عقل پہ حجتیں کیے
دل کو عروج و ارتقا کی سبھی قوتیں دیے
غلبۂ دیں کا مدعا طاعتِ خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صلِ علیٰ نبینا عہد ازل کی بزم میں
اُن پہ نبوتیں نثار اُن پہ فدا رسالتیں
حق سے کسی نبی کو پر جو بھی ملیں فضیلتیں
قول و قرار انبیاء نصرتِ خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا جان حقائق ان کا حق
امر و ادب کے ہر کسی حق پہ ہے فائق ان کا حق
حق پہ نثار جان بھی کرنے کے لائق ان کا حق
حکم، ریاست، اقتدا بیعت خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا عز و وقار کی قسم
جان و دل و نگاہ کے چین و قرار کی قسم
صبح و مسا کا زر لیے لیل و نہار کی قسم
شانِ جمالِ کبریا صورتِ خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا آئینۂ شعور سے
منزلِ عقل و فکر کی ہر رہ ہے نزد و دور سے
زُہد و ورع سے مشکبو حسنِ عمل کے نور سے
شرحِ مبینِ الہدیٰ سنتِ خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا روشنی سبل ہیں وہ
جس کی مہک ابد تلک باغِ ازل کا گل ہیں وہ
آیت الکتاب کی جزو ہیں سب تو کل ہیں وہ
نیّر کاشف الدجیٰ سیرتِ خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا ’’یوم ہدایت صمد‘‘
بعثتِ مصطفیٰؐ سے ہے عہد عبادتِ احد
علم بالقلم کا زر سب پہ ہے نعمتِ ابد
قاسمِ ’’نعمۃ الہدیٰ‘‘ حضرت خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا اے ورثائے امرِ دیں!
تم میں کسی مرد کے باپ نہیں وہ بالیقیں
ہیں وہ مگر رسولِ حق، ہیں وہ نبی آخریں
’’دینِ بیانِ حق ہے با آیت خاتم الرسل‘‘
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا مدح تو بے شک اُن کی ہے
’’فیض، ادب، ثنا‘‘ ہیں خو، خو یہ مبارک اُن کی ہے
نعت بہ ’’عظمتِ ازل‘‘ نعت ابد تک ان کی ہے
پھر بھی بیاں سے ہے سوا عظمت خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

صل علیٰ نبینا اُن کی نظر مری طرف
آصف انہی کے نور سے مجھ کو ملے ہیں یہ صدف
’’نعت ہے جشنِ نعت‘‘ اور ’’نعت ہے ذروۂ شرف‘‘
ہم پہ رہے یونہی سدا نعتِ خاتم الرسل
صل علیٰ محمد

مرزا آصف رسول

# عقیدت

سائبان ہے سر پہ اپنے رَبّ کی رحمت کا
لمحہ لمحہ ہے مظہر اُس کے فضل و برکت کا

اے خدا ترے در سے ایک شے کا طالب ہُوں
تو مجھے مُقلد رکھ شاہؐ دیں کی سنّت کا

اور کچھ نہیں لیکن! اتنا جانتے ہیں ہم
وہ جو اُس کا بندہ ہے، بندہ ہے محبت کا

اپنی قربتیں یارب! مجھ پہ منکشف کر دے
تیری چاہ سے بڑھ کر کب ہے شوق جنّت کا

اے ندیم مجھ کو ہے ناز اِس سعادت پر
نغمہ ہے مرے لب پر کبریا کی مدحت کا

**ریاض ندیم نیازی**

---

انتخاب

**خالد احمد**

نعمان منظور

اک سطر میں ہوئے ورقِ جان و تن تمام
لیکن ہوا نہ تذکرۂ پیرہن تمام

# رباعیات

چڑیوں کی ہے چہکار تعلق اپنا
پھولوں کی ہے مہکار تعلق اپنا
الفاظ سے کم واسطہ رکھتے ہیں ہم
آنکھوں کی ہے گفتار تعلق اپنا

---

دریا میں اترنا کچھ لازم تو نہیں
اس عشق میں مرنا کچھ لازم تو نہیں
معقول طریقے سے منائیں فرقت
صحرا سے گزرنا کچھ لازم تو نہیں

---

مشکل ہوئے حالات کہاں جائیں ہم
وحشت زدہ دن رات کہاں جائیں ہم
سب مارنے مرنے کے لیے آمادہ
اوپر سے ہیں آفات کہاں جائیں ہم

---

الفت کا جو رستہ ہے، ہے الٹا سیدھا
اور اس کا جو شیدا ہے، ہے الٹا سیدھا
دانش کی کوئی بات اثر کرتی نہیں
شوریدہ سا چسکا ہے، ہے الٹا سیدھا

---

دل جان سے پیارا تھا، ہمارا نہ ہوا
قسمت کا ستارہ تھا، ہمارا نہ ہوا
دن رات تڑپتے رہے آگے اس کے
اس شخص ہمارا تھا، ہمارا نہ ہوا

جیسا بھی ہوں بیٹھا ہوں تری بستی میں
ہر حال میں اچھا ہوں تری بستی میں
چپ چاپ سا رہتا ہوں کوئی بات نہیں
روتا ہوں، نہ ہنستا ہوں تری بستی میں

---

سچ مچ کے تھے حالات، کہانی سمجھی
اس نے مری ہر بات کہانی سمجھی
ہوتا رہا برباد مسلسل میں بھی
ہنستی رہی دن رات، کہانی سمجھی

---

جیون میں ملاقات ضروری تو نہیں
ہمدرد ہو حالات ضروری تو نہیں
رہتا نہیں یہ وقت کسی کا اشعر
اپنے رہیں دن رات ضروری تو نہیں

## سعید اشعر

# رباعیات

گلشن میں نسیمِ جستجو نالاں ہے
حیرت سے نگاہِ رنگ و بو نالاں ہے
باہر جو نہ آیا دیدۂ خواب سے میں
دستِ حسرت سے آرزو نالاں ہے

---

آئینہ خانۂ تماشا ہو گیا
کشکولِ نظر دیدۂ بینا ہو گیا
ہے بزم گہِ وجود میں رقصِ خیال
یہ کعبۂ دل عرشِ تمنا ہو گیا

---

تجدید کی شاخ تختی سے اگتی ہے
یہ روشنی حرف پاشی سے اگتی ہے
الفاظ سے نظریے جنم لیتے ہیں
تہذیب قلم کی کھیتی سے اگتی ہے

---

گل نیرنگِ شگفتۂ حسرت ہے
خوشبو کے لئے پیرہنِ وحشت ہے
دستک ہے صبا کی نگۂ غنچہ کشا
ہر دیدۂ نقش تشنۂ حیرت ہے

---

یہ مشعلِ تکوینِ گزر گاہِ زماں
تجدید کی لو میں نہیں ہے عکس فشاں
ہے قریۂ خواب تشنۂ لمسِ خیال
بے پیرہنِ فراق کتنے ہیں جہاں

صورت ہے کہیں جہاں تڑپتا ہے کہیں
سائے میں عکسِ جاں تڑپتا ہے کہیں
عالم ہے گمان در گمان ایک گماں
ہر نقش تہِ گماں تڑپتا ہے کہیں

---

طاؤسِ چمن خیال ہے پر کے بغیر
ہے خواب کا شہر دیدۂ در کے بغیر
سر میں ہے گماں اور گماں میں ہے سر
میں ایک گماں ہوں کاسۂ سر کے بغیر

---

ہے شعلۂ نقشِ دود میں رقصندہ
یہ کون ہے ہست و بود میں رقصندہ
آئینہ کوئی عکسِ تصویر بہ دست
ہے دائرۂ نمود میں رقصندہ

محمد نصیر زندہ

# ہائیکو

پیش کر دی انا برائے فروخت
چھید اتنے ہوئے ہیں کشتی میں
رکھ دیا ناخدا برائے فروخت

میرا دل اُس کی گرد تک پہنچے
آئے اس عشق میں مقام ایسا
اُس تلک آہِ سرد تک پہنچے

آج پھر دھوپ زرد جھولی ہے
اپنی پلکوں سے اب لگاؤں گا
تیرے قدموں کی گرد جھولی ہے

دھوپ کا سایہ جسم سے نکلا
گھیر بیٹھی ہیں قاف کی پریاں
میں کہاں اِس طلسم سے نِکلا

کم سِنی کی نشانیاں ساری
ذہن سے محو ہو نہیں سکتیں
وہ پری کی کہانیاں ساری

دوستی کرلیں ساری پریوں سے
ایک دن کوہِ قاف بھی جائیں
دُکھ سُنیں غم کی ماری پریوں سے

وہ پری ہے مگر پَروں کے بغیر
اُس کی یادوں کے بِن دماغ ہے یوں
جیسے انسان ہوں سَروں کے بغیر

دشت میں گرد اُڑ رہی ہے مگر
تُو سمجھتا ہے آ گئی منزل
اُونٹنی راہ مُڑ رہی ہے مگر

پھول بیچے خریدے خار بہت
خوشبوؤں کی سدا تجارت کی
دل سے اُٹھتے رہے غبار بہت

رند پیتے رہے شراب کا عرق
جسم دیکھا ہے ایک ناری کا
جیسے بوتل میں ہو گلاب کا عرق

تم نے جانے ہیں جسم کے اسرار
یہ نہیں خاک، یہ حقیقت ہے
جان لو، اس طلسم کے اسرار

رقص دریا کا دیکھنے آ جا
یہ محبت ڈبو دے پانی میں
ہر نشانی ہی پھینکنے آ جا

خواب کیسے فروخت کر ڈالوں
عمر بھر خون سے انھیں سینچا
کم ہیں پیسے فروخت کر ڈالوں؟

آس مدفون ہے ابھی دِل میں
اُس کی خوشبو جدا نہیں ہو گی
ایک زیتون ہے ابھی دل میں

آفتاب خان

# بُود و نبُود

صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ اکتوبر کی ہلکی خنکی نے اسلام آباد کی سڑکوں کو ابھی پوری طرح اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا۔ کھڑکی کے باہر نیم کے درخت پر بیٹھی چڑیاں شور مچا رہی تھیں اور سامنے والی سڑک پر دودھ والے کی موٹر سائیکل کے سائلنسر کی آواز گونج رہی تھی۔ کمرے میں الارم بجنے سے چند لمحے پہلے ہی توقیر کی آنکھ کھل گئی۔ یہ اُس کی عمر بھر کی عادت تھی۔ الارم ہمیشہ بعد میں بجتا تھا، وہ پہلے جاگ جاتا تھا۔ اس نے بستر کے دوسرے حصے پر نظر ڈالی۔ نوشین ابھی سو رہی تھی۔ سفید بالوں کی چند لٹیں اُس کے ماتھے پر بکھری ہوئی تھیں۔ توقیر نے ہاتھ بڑھا کر اُنھیں آہستہ سے ایک طرف کیا اور کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا۔ یہ وہی چہرہ تھا جسے دیکھ کر کبھی اُس نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے فیصلے کا اعلان کیا تھا۔ گھر والوں کی مخالفت، محدود تنخواہ، کرائے کا چھوٹا سا مکان، مستقبل کی غیر یقینی صورت حال، کچھ بھی تو اُس کی محبت کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکا تھا۔ اُس وقت اُس کے پاس نوشین کو دینے کے لیے محبت کے سوا کچھ نہیں تھا، لیکن اُس نے اسے خوش رکھنے کے لیے اپنی زندگی کا ہر دن گروی رکھ دیا تھا۔

آج ان کا اپنا گھر تھا، گاڑی تھی، بینک میں مناسب رقم موجود تھی اور ماہ بہ ماہ پنشن مستقل سہارا۔ بچوں کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی، بیٹی کی شادی ایک اچھے گھر میں ہوئی تھی اور بیٹا بھی ایک اچھی ملازمت پر تھا۔ زندگی بظاہر اپنے تمام حساب چکا چکی تھی۔ صرف توقیر کے اندر ایک حساب ایسا تھا جس کی کوئی رسید نہیں تھی۔ وہ بستر سے اٹھا، وضو کیا اور نماز پڑھنے کے بعد باورچی خانے میں آ گیا۔ نوشین کے لیے چائے بنانا اب اُس کا معمول تھا۔ پہلے وہ دفتر جانے کی جلدی

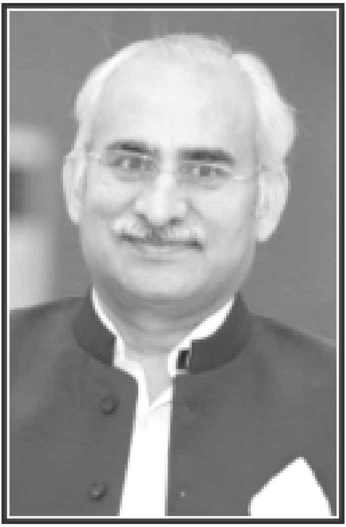

محمد حمید شاہد

میں صرف اپنا کپ بھرتا تھا، اب اُس کے پاس وقت تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وقت اتنا ہو گیا تھا کہ بعض اوقات وہ اُس سے گھبرانے لگتا تھا۔ چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھ کر وہ باہر آیا تو نوشین جاگ چکی تھی۔ اس نے بدن کو اوپر کی سمت کھسکایا اور تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"زینب کا کل فون آیا تھا، کہہ رہی تھی ہفتے کو آؤں گی۔ بچے بھی ساتھ ہوں گے۔"

توقیر نے نوشین کے کھلتے چہرے پر نگاہ کی اور مسکرا دیا۔

"اچھی بات ہے۔ کافی دن ہو گئے اُسے آئے ہوئے۔"

نوشین نے چائے کا کپ اٹھا لیا اور فوراً زینب کے بچوں کے سکول، اُس کے شوہر کے دفتر، اُن کے نئے فرنیچر اور پچھلے ہفتے ہونے والی ایک خاندانی تقریب کا ذکر شروع کر دیا۔ توقیر سنتا رہا اور ہاں ہوں کرتا رہا تاکہ اس کی بیوی مطمئن رہے کہ اسے وہ توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے سنتا آیا تھا۔ پہلے بھی، جب وہ دفتر جانے کے لیے جوتے پہن رہا ہوتا، نوشین بات کرتی رہتی اور وہ سنتا رہتا۔ گھر کی باتیں، اِدھر اُدھر کی باتیں، اپنی دلچسپی کی باتیں اور وہ دروازے پر کھڑے ہاں ہوں کرتا رہتا تھا۔ ان باتوں میں اس کے جواب دینے کو کچھ نہ ہوتا۔ اسے بس سننا ہوتا تھا اور نوشین کو یقین دلانا ہوتا تھا کہ وہ سن رہا تھا۔ اب بھی ایسا ہی تھا۔ فرق تھا تو اتنا کہ پہلے اُسے جلدی ہوتی تھی اور اب اُس کے پاس پورا دن پڑا تھا۔

وہ رات کو دیر تک جاگتا رہتا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کے سینے میں ایک عجیب سا بوجھ رہنے لگا تھا۔ بظاہر کوئی تکلیف نہیں تھی، کوئی بیماری نہیں تھی، بس ایک بے نام سی گھٹن تھی، جیسے اندر کوئی بات تھی جو زبان تک آنے کا راستہ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کو کہنا چاہا کہ نسرین کبھی اس کے پاس بھی بیٹھا کرے۔ کبھی اس سے بھی پوچھ لیا کرے کہ اس کا دن کیسا گزرا۔ مگر ہر بار نوشین کا فون بج اٹھتا۔ کبھی زینب کا، کبھی اس کی بہنیں فون پر ہوتیں، کبھی بیٹی یا اس کی ماں۔ اس کا فون مسلسل مصروف رہتا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ بیٹی سے وہ باتیں کر رہی تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ اپنی دلچسپی کی باتیں:

"ہاں بیٹا، کیا ہوا؟...... اچھا! وہ نیلے رنگ والا سوٹ لے لینا...... نہیں، تمھارے ابو کو کیا پتا ان چیزوں کا...... اچھا سنو، بچے کی طبیعت اب ٹھیک ہے نا؟"

توقیر نے اپنا کپ ختم کیا، ٹرے اٹھائی اور باورچی خانے میں چلا گیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اُس کے پاس کہنے کو کیا تھا۔ بس یہ کہ کوئی اُس کی بات بھی سنے۔ لیکن یہ خواہش اُسے ہر گزرتے دن کے ساتھ

زیادہ وہ نامناسب محسوس ہونے لگی تھی۔
توقیر نے زندگی کا آغاز کسی غیر معمولی حیثیت سے نہیں کیا تھا۔ باپ ایک معمولی سرکاری ملازم تھا۔ گھر میں پانچ بہن بھائی تھے اور تنخواہ مہینے کے آخری ہفتے تک اکثر دم توڑ دیتی تھی۔ توقیر نے تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ کبھی کسی دکان کے حساب کتاب میں ہاتھ بٹایا اور کبھی ایک نجی ادارے میں کلرک کی حیثیت سے کام کیا۔ اُس دفتر میں نوشین بھی تھی۔ ایک سادہ سی لڑکی تھی جو بات کرتے ہوئے ہنس دیتی تھی اور ہنستے ہوئے اپنی بات بھول جاتی تھی۔ توقیر کو اُس کی یہی عادت اچھی لگی، جو محبت کا آغاز ہو گئی۔ شادی کے بعد اس نے بیوی کو ملازمت کی پابندی سے آزادی دلوا دی کہ اب وہ اس کی ذمہ داری تھی اور محبت بھی۔
آنے والے برسوں میں وہ صبح جلدی نکلتا اور رات دیر سے گھر لوٹتا۔ ترقی کے لیے امتحان دیے، اضافی ذمہ داریاں اٹھائیں، دفتر کے بعد ایک نجی ادارے کے کام میں ہاتھ بٹایا، قسطوں پر گاڑی خریدی، پھر چھوٹا سا پلاٹ لیا اور کئی برس کی بچت سے گھر تعمیر کیا۔ نوشین نے بھی اُس کے ساتھ بہت تنگی دیکھی تھی۔ کرائے کا مکان تھا۔ مہینے کے آخر میں دودھ والے کی طرح سبزی والا بھی حساب لکھنے لگتا۔ سردیوں میں گیس کی کمی کے باعث چولہے پر پانی گرم ہونے میں دیر لگتی تو نوشین ہنستے ہوئے کہتی:
"تمھارے دفتر کی ترقی سے پہلے اس گیزر کی ترقی ضروری ہے۔"
توقیر بھی ہنس پڑتا۔ وہ دن مشکل تھے، لیکن ان میں قربت اور شراکت کی سرشاری تھی۔ دونوں کے پاس اشیا اور سہولتیں کم تھیں مگر وہ ایک دوسرے کو میسر تھے اور ایک دوسرے کے پاس بیٹھنے اور باتیں کرنے کو تھوڑا وقت بھی بہت تھا۔ ان کے ہاں پہلی اولاد ہوئی، تو نوشین کی خوشی اور بیٹے میں انہماک دیدنی تھا۔ بیٹے کا نام آنس اسی نے رکھا تھا۔ پھر زینب پیدا ہوئی۔ گھر میں کھلونے بکھرنے لگے، دودھ کی بوتلیں آنے لگیں، سکول کی فیسوں کے لیے الگ رقم رکھی جانے لگی۔ توقیر کی زندگی کا مقصد اب صرف نوشین کو خوش رکھنا نہیں رہا تھا۔ اُس کے لیے دو چھوٹے چہرے مستقبل کی صورت اختیار کر چکے تھے۔
اس کی اپنی ضرورتیں سکڑنے لگیں کہ بچوں کی ضرورتیں بڑھ رہی تھیں۔ چھٹیوں میں مری جانے کا پروگرام منسوخ کیا تاکہ زینب کے لیے کمپیوٹر خریدا جا سکے۔ اپنی گاڑی کئی برس تک تبدیل نہ کی تاکہ بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بچت پوری ہو سکے۔ اُسے ان قربانیوں پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔ وہ سمجھتا تھا کہ باپ ہونا شاید یہی ہے۔ اپنی خواہشوں

کو بچوں کی خواہشات کے سامنے التوا میں ڈالنا، اپنی تھکن کو مسکراہٹ کے پیچھے چھپا لینا اور اپنے مستقبل کو اُن کے مستقبل سے وابستہ کر لینا۔ مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ بعض اوقات جس محبت کو ہم اپنی زندگی کا مرکز بنا دیتے ہیں، وہی محبت آہستہ آہستہ ہماری موجودگی کو محض عادت بنا کر ہمارا وجود ہی منہا کر دیتی ہے۔

آنس اور زینب بڑے ہونے لگے تو گھر میں ایک نیا نظام قائم ہو گیا۔ آنس کو یونیورسٹی جانا تھا اور زینب کو کالج۔ دونوں کے دوست تھے، اپنے منصوبے تھے، اپنی اپنی دنیا تھی۔ توقیر چاہتا تھا کہ بچے اُس کے ساتھ بیٹھیں، اپنی باتیں بتائیں، کبھی اُس سے اختلاف کریں، کبھی کسی بات پر بحث کریں۔ مگر اکثر ایسا ہوتا کہ آنس گھر آتے ہی ماں کے پاس چلا جاتا۔ وہ نوشین پر رشک کرتا کہ بیٹا ماں کے ساتھ زیادہ مانوس تھا۔ نوشین اُس کی باتیں سنتی، ہنستی چلی جاتی۔ آنس بھی اُس کے سامنے کھل کر بولتا تھا، اپنے دوستوں کے نام بتاتا، اپنی پریشانیاں بیان کرتا اور کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کہہ دیتا جو شاید کسی اور کے سامنے کہتے ہوئے اُسے جھجک محسوس ہوتی۔

توقیر دوسرے کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھتا رہتا۔ کبھی کوئی دلچسپ بات سنتا تو اخبار نیچے کر کے کہتا:

"اچھا! پھر کیا ہوا؟"

آنس ایک لمحے کے لیے اُس کی طرف یوں دیکھتا، جیسے اسے اپنے باپ کے وہاں ہونے کا ابھی پتہ چلا ہو۔

"کچھ نہیں ابو، بس ایسے ہی۔"

اور یوں بات وہیں ختم ہو جاتی تھی۔ توقیر نے کبھی آنس کو ڈانٹ کر خاموش نہیں کرایا تھا۔ وہ اُس کی پسند ناپسند کا خیال رکھتا تھا، اُس کی تعلیم کے فیصلوں میں رہنمائی کرتا تھا۔ جب کبھی بیٹے کو کسی مشکل کا سامنا ہوتا، وہ سب سے پہلے ماں کو بتاتا تھا۔ نوشین توقیر کو بتاتی۔ ماں کے وسیلے سے اپنے باپ کی مدد چاہنا، مشکل کا حل مانگنا اور دل کی بات کہنا دو مختلف چیزیں تھیں۔

آنس اپنے باپ سے براہ راست مشورہ لے سکتا تھا، رقم مانگ سکتا تھا، ملازمت کے سلسلے میں اُس کی مدد حاصل کر سکتا تھا مگر اسے سہولت محسوس ہوتی تھی کہ ماں وسیلہ بنے۔ وہ اپنی ناکامی کا مذاق اُڑانے، اپنی کمزوری پر ہنسنے یا کسی دوست کی بے وقوفی کا قصہ سنانے کے لیے بھی اپنی ماں ہی کو زیادہ موزوں سمجھتا تھا۔ نوشین کے سامنے وہ بیٹا تھا۔ توقیر کے سامنے وہ ایک ایسا نوجوان تھا جسے اپنے باپ کی نگاہ میں کامیاب بھی رہنا تھا۔ یہ فرق کسی نے طے نہیں کیا تھا۔ یہ خود بخود قائم ہوتا چلا گیا تھا۔

..........

آنس دیر سے گھر آیا تھا۔ اُس کے ساتھ دو دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔
توقیر اپنے کمرے میں کتاب پڑھ رہا تھا کہ اُن کے قہقہوں کی آواز آئی۔ وہ باہر نکلا۔ آنس اپنے دوست کے کسی قصے پر ہنس رہا تھا۔ اس کی ہنسی میں وہی بے ساختگی تھی جو توقیر نے برسوں پہلے اُس کے بچپن میں دیکھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے توقیر کا جی چاہا کہ وہ ان کے پاس جا کر بیٹھے اور مل کر ہنسے۔ وہ بچوں کے قریب پہنچا تو آنس فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
"آیئے ابو، آپ کو کچھ چاہیے؟"
توقیر ٹھٹک کر وہیں ٹھہر گیا اور جیسے کچھ شرمسار سا ہو، کہنے لگا۔
"نہیں بیٹا، میں نے سوچا تم لوگوں کے ساتھ بیٹھوں گا۔"
"جی ابو، ضرور۔"
آنس نے صوفے پر ایک جانب کھسکتے ہوئے جگہ بنائی مگر اس کے لہجے میں ایک ایسی احتیاط آگئی تھی جو چند لمحے پہلے وہاں موجود نہیں تھی۔ باپ وہاں بیٹھ گیا تو دوستوں کی گفتگو جیسے رک سی گئی تھی۔ ایک دوست علی نے موبائل نکال لیا۔ دوسرا شبیر تھا جو کھانے کی تعریف کرنے لگا تھا۔ پھر تینوں چپ ہو گئے تو سناٹا گونجنے لگا۔ توقیر بھی چند منٹ تک چپ بیٹھا رہا مگر اسے وہاں اپنا وجود اجنبی لگا تو یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا کہ تم لوگ باتیں کرو۔ اپنے کمرے میں آ کر اُس نے کتاب کھولی، مگر پڑھ نہ سکا۔ اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ شاید اُس کے بچے اُس سے ڈرتے نہیں، مگر اُس کے سامنے آزاد بھی نہیں تھے۔ وہ اُس کی عزت کرتے تھے۔ اتنی عزت کہ اُس کے سامنے اپنے اندر کے بے ترتیب، غیر سنجیدہ، نادان اور کبھی کبھی احمق انسان کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، مگر شاید توقیر کو اپنے بچوں کے انہی حصوں سے محبت تھی جنھیں وہ اُس سے چھپاتے تھے۔

..............................

وقت کے ساتھ گھر بڑا ہوتا گیا اور توقیر کی دنیا چھوٹی۔ اس کی ترقی ہوئی۔ عہدہ بڑھا۔ دفتر میں لوگ اُس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لیتے۔ ماتحت اُس کی بات غور سے سنتے۔ میٹنگ میں اُس کے بولنے پر خاموشی چھا جاتی۔ اُسے یہ سب اچھا بھی لگتا تھا۔ انسان محنت کرتا ہے تو اپنے کام کی قدر چاہتا ہے۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ عادت دفتر سے گھر آتے ہوئے اُس کے ساتھ ہو لیتی تھی۔ کھانے کی میز پر اگر وہ کوئی بات کرتا تو سب توجہ سے سنتے۔ "جی ابو"...... "بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"...... "آپ کا تجربہ زیادہ ہے۔"...... اور پھر گفتگو ختم ہو

جاتی۔ وہ چاہتا تھا کہ کبھی کوئی اُس کی بات کاٹ کر کہے، ''ابو، آپ کو کچھ نہیں پتا!'' اور پھر خود ہی ہنس پڑے۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اُس کے بنائے ہوئے منصوبے پر اعتراض کرے، اُس کی کسی پرانی غلطی کا مذاق اُڑائے یا اُسے بتائے کہ آج اُس نے کسی سے جھگڑا کیا ہے اور اب اسے سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کرے لیکن گھر میں اُس کی رائے مشورہ تھی، اُس کی بات نصیحت تھی، اُس کی خاموشی سنجیدگی تھی۔ کسی نے اُسے یہ اختیار نہیں دیا تھا کہ وہ بھی کبھی کمزور ہو سکے۔

زینب کی شادی ہوئی تو توقیر نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر انتظام کیا۔ اچھا گھر، اچھا فرنیچر، بیٹی کی پسند کے کپڑے اور دوسرا ضرورت کا سامان، مہمانوں کے لیے ایک معروف مارکی میں مہندی کی تقریب اور بارات کا استقبال۔ شادی کے بعد جب زینب رخصت ہو رہی تھی تو پلٹ کر باپ کے گلے لگ گئی۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

''ابو، میں آپ کے بغیر کیسے رہوں گی؟''

توقیر نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر اپنے دل پر۔ اور بہت نرم آواز میں کہا:

''پاگل لڑکی، تمھارا اپنا گھر ہے، جب دل چاہے آ جانا۔''

اس نے بیٹی کے سر پر بوسہ دیا۔ اُس وقت اُس کے دل میں ایک عجیب سا اطمینان تھا۔ اُسے لگا کہ اُس نے اپنی بیٹی کو زندگی کے لیے تیار کر دیا تھا۔ اور وہ واقعی اگلی زندگی میں اترنے کو تیار تھی۔

---

زینب اپنے گھر میں خوش تھی۔ شوہر اچھا تھا، بچے تھے، گھر کے معمولات تھے۔ مگر اُس کی ماں سے قربت شادی کے بعد کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔ اب فون پر روز بات ہوتی۔ کبھی کھانا پکانے کا طریقہ پوچھتی، کبھی بچوں کی کسی عادت پر مشورہ لیتی، کبھی اپنے شوہر کی مصروفیت کا ذکر کرتی اور کبھی صرف یہ کہتی کہ امی، آج آپ کی بہت یاد آ رہی ہے۔ نوشین اُس کی ہر بات کا جواب دیتی۔ توقیر کبھی فون کے پاس بیٹھا ہوتا تو زینب اُس سے بھی بات کر لیتی۔

''ابو، آپ کیسے ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں، بیٹا۔ تم سناؤ۔''

''بس ابو، سب ٹھیک ہے۔ امی سے بات کر رہی تھی۔ اچھا، آپ دوا وقت پر لے لیا کریں۔''

''ہاں، ضرور۔''

''اچھا ابو، اللہ حافظ۔''

بس اتنی ہی بات ہوتی اور فون بند ہو جاتا۔ توقیر کو زینب کی محبت پر کوئی شک نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیٹی اُس سے پیار کرتی ہے۔ اس نے اُس کے لیے زندگی بھر محنت کی تھی

اور زینب اُس کی قربانیوں کو پہچانتی بھی تھی۔ لیکن محبت کا پہچانا جانا اور محبت کا روزمرہ زندگی میں شریک ہونا ایک ہی بات نہیں ہے۔ اسے بیٹی کی ضرورت اب بھی تھی، مگر بیٹی کے لیے یہی کافی تھا کہ باپ موجود تھا، اسے اُس کی ضرورت زیادہ تر کسی خاص موقع پر پڑتی تھی۔ توقیر کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ زینب کبھی فون کر کے پوچھے، کہ ابو، آج آپ کا دل کیسا ہے؟ دن کیسے کٹتا ہے، وہ ہنسے اور اسے بھی ہنسائے مگر ایسا نہیں ہو پا رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ توقیر نے کبھی کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اُس کا دل کیسی کیفیات سے گزرتا تھا۔

ریٹائرمنٹ کا دن اُس کی زندگی کے یادگار دنوں میں سے ایک تھا۔ دفتر میں تقریب ہوئی۔ پھولوں کے ہار پہنائے گئے، یادگاری شیلڈ دی گئی، ساتھیوں نے اُس کی محنت اور دیانت داری کی تعریف کی۔ ایک نوجوان افسر نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ توقیر صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کردار سے ادارے میں عزت کمائی۔ سب نے تالیاں بجائیں۔ توقیر کا دل خوشی سے بھر گیا، اس نے فخر سے سر بلند کیا اور مسکرا دیا۔

گھر پہنچا تو نوشین نے اُس کے لیے پسندیدہ کھانا بنایا ہوا تھا۔ آنس نے پھولوں کے گلدستے ساتھ کر دیے تھے، ماں نے ویڈیو کال پر زینب کو دکھائے تو اس نے مبارک باد دی۔ رات کو سونے سے پہلے توقیر دیر تک جاگتا رہا۔ اُس نے سوچا کہ اب صبح جلدی اٹھنے کی پابندی نہیں ہوگی۔ اب وہ نوشین کے ساتھ وقت گزارے گا، آنس کے ساتھ کہیں باہر جائے گا، زینب کے گھر زیادہ آیا جایا کرے گا۔ شاید اب زندگی میں وہ سب کچھ ہو سکے گا جسے وہ ملازمت کے برسوں میں وقت نہ ہونے کی وجہ سے ٹالتا رہا تھا۔

اگلی صبح وہ معمول کے مطابق چھ بجے جاگ گیا۔ چائے بنائی۔ نوشین کے ساتھ بیٹھا۔ پھر اخبار پڑھا۔ دس بجے تک اخبار ختم ہو گیا۔

اس نے ٹیلی ویژن کھولا۔ خبریں دیکھیں۔ کچھ دیر بعد بند کر دیا۔ آنس دفتر چلا گیا تھا۔ نوشین گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ توقیر نے اکتا کر بازار چلنے کا سوچا۔ اس نے بیوی سے ساتھ چلنے کو کہا تو اس نے کہا کہ پہلے وہ کام ختم کر لے۔ وہ الماری میں کپڑے رکھ رہی تھی۔ اسے کچھ اور کام بھی یاد آ گئے تھے لہٰذا اسے دیکھتے ہوئے کہا:

”آنس آ جائے تو شام کو چلیں گے۔“

”اچھا۔“

شام کو آنس آیا تو تھکا ہوا تھا۔ توقیر نے کہا:

"بیٹا، سوچ رہا تھا کہیں باہر چائے پینے چلتے ہیں۔"
آنس نے جوتے اتارتے ہوئے جواب دیا،
"ابو، آج بہت تھک گیا ہوں۔ کل چلیں گے۔"
کل، پرسوں ہوتی رہی۔ دن اور راتیں لمبی ہوتی گئیں اور اُسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اصل مسئلہ وقت کی کمی نہیں، وقت کی زیادتی تھا۔ دفتر میں اُس کے دن دوسروں کی ضرورتوں سے بھرے رہتے تھے۔ گھر میں اُس کے پاس اپنی ضرورتوں کے سوا کچھ نہیں تھا، اور اپنی ضرورتوں کا اظہار کرنے کی اُسے عادت نہیں تھی۔
چند ہفتے بعد اُس نے محلے کی ایک لائبریری میں جانا شروع کیا۔ وہاں چند ریٹائرڈ حضرات ملتے تھے۔ چائے کے کپ پر سیاست، مہنگائی، پنشن اور پرانے دفتری قصے زیرِ بحث آتے۔ توقیر ان محفلوں میں ہنستا بھی تھا۔ کبھی کوئی لطیفہ سنا دیتا، کبھی کسی پرانی یاد کا ذکر کرتا۔ مگر گھر واپس آتے ہوئے اُسے محسوس ہوتا کہ وہ اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لوگوں کو سنا سکتا ہے، سوائے اس کے کہ گھر میں اُسے تنہائی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات وہ کسی سے کیسے کہتا؟ جس آدمی نے پوری عمر گھر والوں کو تحفظ دیا ہو، وہ ان سے یہ کیسے کہے کہ اب مجھے بھی کسی کے سہارے کی ضرورت ہے؟
ایک اتوار کی دوپہر زینب اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں کھلونوں کا ڈھیر تھا۔ نوشین نواسے کو کھانا کھلا چکی تو نواسی کے بال سنوارنے لگی تھی۔ زینب اپنے موبائل پر کوئی وڈیو دیکھتی رہی۔ ماں ننھی کے بال سنوار چکی تو زینب ماں کے پاس جا بیٹھی اور اسے کسی ڈش کی نئی ترکیب بتانے لگی۔ توقیر وہیں بیٹھا تھا۔ جیسے سب سے غیر متعلق ہو۔ پھر اکتا کر ننھے نواسے نعمان کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے پوچھا:
"سکول میں کیا پڑھتے ہو بیٹا آج کل؟"
بچے نے مختصر سا جواب دیا اور فوراً اپنی نانی کی طرف مڑ گیا۔
"نانو، آپ کو پتا ہے، آج میں نے ایک گیم میں سب سے زیادہ پوائنٹس لیے ہیں!"
"اچھا! دکھاؤ تو ذرا۔"
ننھا نعمان موبائل لے کر نوشین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ توقیر نے چائے کا کپ اٹھا لیا اور اپنی بیوی کو دیکھا جو نواسے کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد زینب نے کہا:
"امی، اگلے ہفتے ہمیں بچوں کے ساتھ مری جانا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں گی نا؟"
"ہاں بیٹا، کیوں نہیں!"
نوشین فوراً بولی۔ توقیر نے بے اختیار کہا:
"میں بھی چلوں گا۔ کافی دن سے کہیں باہر

نہیں گیا۔“

زینب نے خوش دلی سے جواب دیا:

”بالکل ابو، آپ بھی چلیں۔“

بات آئی گئی ہوگئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اُسے ساتھ لے جانے کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔ اس نے خود اپنے لیے جگہ بنائی تھی، اور اب سب اس کی خواہش کا احترام کر رہے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ زینب نے غلط کچھ نہیں کہا۔ وہ واقعی چاہتی تھی کہ باپ بھی ساتھ چلے لیکن توقیر کے اندر کوئی چیز بجھ سی گئی تھی۔ اسے یاد آیا، جب زینب چھوٹی تھی تو بازار جانے کے لیے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی تھی۔ اُسے کسی دعوت میں لے جانا ہوتا تو صبح سے اُس کے پیچھے لگی رہتی۔ وہ دفتر سے دیر سے آتا تو دروازے پر کھڑی انتظار کرتی۔ اُس وقت اُسے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ بیٹی اُس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے کوئی انتظام کر رہی ہے۔

وہ وقت خود اُن کے درمیان بہتا تھا۔ اب ہر ملاقات کے لیے ایک موقع، ایک پروگرام، ایک وجہ درکار تھی۔ اس نے نوشین کو دیکھا۔ وہ اب بیٹی کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ زینب بھی ہنس رہی تھی۔ توقیر ان دونوں کو دیکھ کر مسکرایا۔ اسے ان کی خوشی سے حسد نہیں تھا، وہ تو بس اُس خوشی کا حصہ بننا چاہتا تھا۔

ایک دن نوشین بیمار ہوگئی۔ کوئی بڑی بیماری نہیں تھی ہلکا سا بخار اور کمزوری تھی۔ توقیر نے ڈاکٹر کو فون کیا، دوا لایا، وقت پر کھانا تیار کیا اور رات بھر اُس کے سرہانے بیٹھا رہا۔ صبح آنس نے دفتر جانے سے پہلے ماں سے طبیعت کا پوچھا۔ تو ماں نے کہا کہ وہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔ آنس نے باپ کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں:

”ابو، آپ نے رات کو نیند نہیں کی؟“

”تھوڑی بہت کر لی تھی۔“

”آپ آرام کر لیں ورنہ آپ بھی بیمار پڑ جائیں گے، میں شام کو جلدی آجاؤں گا۔“

توقیر کے دل میں خوشی کی ایک چھوٹی سی لہر اُٹھی۔ شاید آنس نے محسوس کیا تھا کہ اُسے بھی آرام کی ضرورت تھی۔ شام کو آنس آیا تو سیدھا ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ اُس کے لیے پھل لایا تھا۔ نوشین کی طبیعت پوچھی، اُس کے پاس بیٹھا اور دفتر کی باتیں کرنے لگا۔ توقیر کمرے کے دروازے پر کھڑا سنتا رہا۔ آنس نے ماں کو بتایا کہ آج اُس کے باس نے اُس کے کام کی تعریف کی تھی۔ پھر کسی ساتھی کا قصہ سنایا۔ دونوں ہنسنے لگے تھے۔ توقیر اندر آیا تو آنس نے فوراً کہا:

”آیئے ابو، بیٹھیں۔“

توقیر بیٹھ گیا۔ آنس نے باس والی بات دوبارہ شروع کی، مگر اب وہ اپنے الفاظ کا انتخاب کر رہا تھا۔ جہاں پہلے وہ بے تکلفی سے کسی کی نقل اتار رہا تھا، وہاں اب صرف

واقعہ بیان کر رہا تھا۔ توقیر نے اُس کی طرف دیکھا۔

"بیٹا، تم میرے سامنے بھی اسی طرح بات کیا کرو جیسے اپنی امی کے سامنے کرتے ہو۔"

آنس خاموش ہو گیا۔ پھر باپ کو دیکھا اور رک رک کر کہا:

"جی ابو، میں تو ویسے ہی کر رہا ہوں۔"

توقیر نے مسکرانے کی کوشش کی اور وضاحت کی:

"نہیں بیٹا، میرا مطلب ہے، تمہیں ہر بات میں یہ خیال رکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں کیا سوچوں گا۔ تم میرے بیٹے ہو۔"

آنس نے کچھ لمحے اُس کی طرف دیکھا، مگر کچھ کہا نہیں۔

---

شہر کی روشنیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سڑک پر گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کسی گھر میں جنریٹر چل رہا تھا، کہیں کتے بھونک رہے تھے، اور سامنے والی عمارت کی کھڑکی میں ایک خاندان کھانے کی میز پر بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ توقیر نے کرسی کھینچی اور بیٹھ گیا۔ اسے اپنا پرانا گھر یاد آیا، جہاں رات کو بجلی چلی جاتی تو وہ نوشین اور بچوں کے ساتھ چھت پر آ بیٹھتا تھا۔ آنس چھوٹی چھوٹی باتوں پر سوال کرتا، زینب اپنے سکول کے قصے سناتی، نوشین اُس کی باتوں میں اضافہ کرتی اور کبھی کبھی توقیر خود بھی بچوں جیسی بے وقوفی کر بیٹھتا۔ وہ سب ایک دوسرے کے سامنے نامکمل تھے۔ آنس کو یہ خوف نہیں تھا کہ باپ اُس کی غلطی پر کیا سوچے گا۔ زینب کو یہ فکر نہیں تھی کہ اُس کی بے ربط باتیں کسی کے وقار کے خلاف ہیں۔ نوشین کو یہ ضرورت نہیں تھی کہ ہر بات کو مناسب وقت اور مناسب لہجے میں بیان کرے۔ اور توقیر کو یہ احساس نہیں تھا کہ اُسے اپنی موجودگی کا کوئی جواز پیش کرنا تھا۔

مگر اب، جب کہ نوشین نہیں رہی تھی، زینب اور اس کے بچے سوگ کے دن گزار کر اپنے گھر لوٹ گئے تھے، توقیر کو یوں لگنے لگا تھا جیسے درمیان میں جو رابطے کی کڑی تھی وہ ٹوٹ گئی تھی۔ آنس، بہو اور بچے گھر میں تھے، مگر جیسے ان کی اپنی دنیا تھی۔ اگرچہ کچھ برسوں سے توقیر نوشین کی موجودگی میں بھی تنہائی محسوس کرنے لگا تھا مگر اب یہ تنہائی اس کا سینہ جکڑ لیتی؛ اتنا کہ سانس ہموار رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ایسے میں یہ تاہنگ کہ کوئی اس سے بات کرے، اسے زیادہ اذیت دینے لگی تھی۔ وہ چپکے سے نکلتا اور زینب کی ڈھیری پر اپنے آنسو بہا آتا تھا؛ چپ چاپ، کچھ کہے اور سنے بغیر کہ اب وہ اسی کا عادی تھا، اور یہ ایسی عادت تھی جس نے اس کا اپنا وجود منہا کر دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

# پتوں سے پھسلتی روشنی

موسم بہار کی ڈھلتی دوپہر تھی، مگر آسمان اب بھی کافی روشن اور پرسکون تھا۔ اس کی نیلی سطح پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے سفید ٹکڑے تیر رہے تھے، جیسے کسی نے بے خیالی میں روئی کے نرم گالے آسمان پر یونہی بکھیر دیے ہوں۔

ندا کے ہوم آفس کی کھڑکی سے کینیڈا کا بادلوں سے سجا شفاف آسمان یوں دکھائی دے رہا تھا، جیسے چارلس ہیرلڈ ڈیوس کی کسی پینٹنگ کا پرسکون نیلا منظر ہو۔

وہ میز کے پیچھے اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ لیپ ٹاپ سامنے کھلا تھا، اسکرین پر ایک امیگریشن درخواست کی تفصیلات پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ انھیں خاموشی سے پڑھ رہی تھی، جیسے ہر سطر کو ازبر کر رہی ہو۔ اس کے چہرے پر پیشہ ورانہ سکون تھا، مگر اس کے نیچے ایک دھیمی تھکن بھی رقم تھی — وہ تھکن جسے صرف ریحان کی نگاہ ہی پڑھ سکتی تھی۔

ریحان کچن میں کھڑا تھا۔ کیتلی سے اٹھتی بھاپ چائے کی خوشبو کو کچن سے لونگ روم تک خاموشی سے لے آئی تھی۔ وہیں کھڑا کھڑا وہ کن اکھیوں سے ندا کو بھی دیکھے جا رہا تھا — اس کی جھکی ہوئی گردن، اسکرین کی نیلی روشنی، انگلیوں کی محتاط حرکتیں۔ یہ سب اس کے اندر ایک نرم سی حدت پیدا کر دیتی تھیں۔

کھڑکی سے باہر بیک یارڈ میں وہ پودا کھڑا تھا جو انھوں نے پچھلے سال لگایا تھا۔ اس پر تازہ کونپلیں پھوٹی تھیں — ہلکی سبز، چمک دار، جیسے روشنی سے بنی ہوں۔

ریحان نے چائے ہاتھ سے بنے ان دو مگوں میں انڈیلی جو گزشتہ ویک اینڈ پر نیاگرا آن دی لیک سے خریدے تھے۔ ایک مگ اس نے اپنے لیے اٹھایا اور میز پر رکھ دیا اور دوسرا ندا کی طرف بڑھا دیا۔

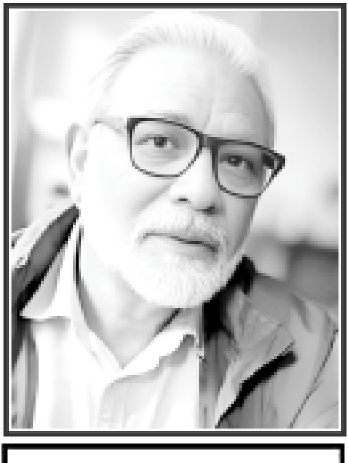

## حامد یزدانی

ندا نے لیپ ٹاپ سے نظر اٹھائے بغیر کہا، ''شکریہ۔''

اور مگ اس کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھ لیا۔

ریحان نے مسکرا کر کہا، ''کیا بات ہے؟ تم کافی دیر سے کھوئی ہوئی ہو اس فائل میں۔''

''بس ... ایک کیس ہے - ذرا پیچیدہ ہے۔ خدشہ ہے، شاید منظور نہ ہو۔''

ندا نے جواب دیا۔

اس پر ریحان بولا، ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تمھارا تیار کردہ کیس اور امیگریشن سے مسترد ہو جائے؟ ناممکن۔''

ندا نے سنجیدگی سے کہا، ''ہم تو کوشش ہی کر سکتے ہیں نا۔ فیصلہ تو انھی کا حق ہے جن کے پاس اختیار ہے۔''

اسی لمحے ریحان کے فون پر نوٹیفکیشن کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون نکالا۔ اسکرین پر ایک نام چمکا — جاوید۔

ریحان چند لمحے اس نام کو دیکھتا رہا۔ اس نے میسج نہیں کھولا۔ ایک ہلکی سی بے چینی اس کے اندر اترنے لگی — وہی بے چینی جو کسی بھولی بسری کہانی کے دروازے پر پہلی دستک بن کر لوٹتی ہے۔

ندا نے آہستہ سے پوچھا، ''کون ہے؟ کیا کچھ ہوا؟''

''نہیں ... کچھ خاص نہیں۔'' ریحان نے دھیمے لہجے میں کہا۔

لونگ روم میں ہلکی روشنی تھی۔ ٹی وی پر نیٹ فلکس کا کوئی کورین شو چل رہا تھا — آواز بند، صرف تصویریں بدلتی ہوئی۔

ریحان نے آخر جاوید کا میسج کھول ہی لیا۔

''ریحان بھائی... اگر وقت ہو تو — بس ایک بات کرنی تھی۔''

ریحان نے فون کا رخ ندا کی طرف کر دیا۔

ندا نے ہلکے سے کہا، ''اب کوئی کام پڑ گیا ہے تو ہی لکھنے کا وقت نکالا ہے۔ وہ کبھی رابطہ نہیں کرتا جب تک...''

جملہ ادھورا رہ گیا — کسی ادھورے تعلق کی طرح۔

ریحان نے کہا، ''میرا خیال ہے، میں اسے کال کر لیتا ہوں۔''

ندا نے سر ہلایا، ''ہاں، ضرور کرو۔ تمھیں پیغام ملا ہے تو جواب دو اب۔''

''کیا پتا بالآخر اسے ملک سے باہر لے جانے والی شریکِ حیات مل گئی ہو۔''

ریحان نے شگفتہ مگر معنی خیز انداز میں کہا۔

ندا نے کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔

ریحان نے نمبر ملایا اور اسپیکر آن کر دیا۔ کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی، پھر جاوید کی آواز سنائی دی۔

''سلام... ریحان بھائی۔''

آواز میں جھجک تھی، اور اس جھجک کے نیچے

کوئی احساس چھپا تھا— جیسے سانس دبی ہوئی ہو۔

”وہ... میرا کیس ہے، امیگریشن کا۔ میں نے شاید دیر کر دی۔ کاغذ پورے نہیں تھے۔ اب... لگتا ہے مشکل ہو جائے گی۔“

ندا نے چائے کا مگ میز پر رکھ دیا اور دھیان سے سننے لگی۔

ریحان نے پوچھا،”تو اب؟“

جاوید نے آہستہ سے کہا، ”اگر... ندا— میرا مطلب ہے ندا بھابی... ایک نظر دیکھ لیں تو؟“

ندا نے ایک لمحے کو نظریں جھکائیں— جیسے کوئی پرانی، ادھوری بات ٹوٹے ہوئے رشتے کی طرح اچانک اس کے دل کے قریب سے گزر گئی ہو: ایک ایسا مسترد لمس جس کی یاد برسوں بعد بھی اپنی ہلکی سی حرارت چھوڑ جاتی ہے۔

پھر وہ فون کے قریب ہو کر پیشہ ورانہ لہجے میں بولی، ”آپ اپنے کاغذات مجھے ای میل کر دیں۔ میں دیکھ لوں گی۔“

”جی... بہت بہتر، ابھی بھیج دیتا ہوں۔“

کال بند ہو گئی۔

ندا نے خاموشی سے لیپ ٹاپ کی طرف دیکھا۔

ریحان نے بھی دیکھا— اور غیر محسوس طور پر ان کے درمیان سوچ کی ایک نرم سی لہر اچھل گئی۔

---

اگلے روز جاوید نے دستاویز کے ساتھ فائل تو بھیج دی— مگر وہ تھی بے ترتیب اور ادھوری۔ ندا فوراً سمجھ گئی کہ سب کام دوبارہ کرنا پڑے گا۔

ریحان نے جاوید کو وڈیو کال ملائی۔ اس بار جاوید نے دیر نہیں کی۔

”جی ریحان بھائی... کاغذات مل گئے؟“

ریحان کے بجائے ندا نے اسپیکر پر کہا، ”جاوید صاحب، میں نے مطلوبہ دستاویزات کی فہرست ای میل کر دی ہے۔ پلیز اسے دیکھ لیں اور اسی ترتیب سے دوبارہ بھیجیں۔“

جاوید نے آہستہ کہا، ”جی ندا بھابی... ابھی دیکھتا ہوں۔“

وڈیو کال بند ہونے سے پہلے ریحان اور ندا نے پس منظر میں جاوید کا کمرہ دیکھا— ایک زردی مائل بلب، ایک بے ترتیب میز، اور کنارے پر رکھا ہوا پلاسٹک کا پودا۔ انتہائی سیدھا، ہرا اور بے حرکت۔

ندا نے سوچا— کبھی وہ اصل پودے رکھا کرتا تھا۔ مٹی بدلتا تھا۔ انہیں دھوپ لگاتا تھا۔ پھر ایک روز اس نے کچھ کہہ دیا۔ کوئی

ایسی بات جس نے ندا کے دل کے آئینے پر ایک باریک مگر دیرپا خراش ڈال دی تھی۔

---

آغازِ شام کی ہلکی روشنی بیک یارڈ میں پھیل رہی تھی۔ ندا نے لیپ ٹاپ بند کیا۔ جاوید کی نئی فائل ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ان باکس خاموش تھا۔

ریحان نے کہا، ”چلو... باہر چلتے ہیں۔“

دونوں باہر آ گئے۔ ننھے پودے کے پتوں اور تازہ کونپلوں پر شام کی روشنی کھلی ہوئی تھی — نرم اور دل کش۔

ریحان نے ایک پتے کو چھوا۔ ندا اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی۔

”شاید جاوید بھیج ہی دے کاغذات، وقت پر۔ یا شاید... نہ بھیجے۔“ ریحان نے کہا۔

ندا نے افق کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، ”اگر بھیج دے گا تو دیکھ لوں گی۔ اگر نہیں... تو بھی ٹھیک ہے۔ کام تو کام ہے۔“

افق پر ایک ہلکی سی سنہری لکیر روشن تھی۔ ندا نے اسے دیکھتے ہوئے محسوس کیا — کچھ فیصلے وقت پر نہ لیے جائیں تو موسم بدل جاتے ہیں۔ اور کچھ موسم... زندگی میں بس ایک بار آتے ہیں۔

دونوں کچھ دیر پودے کے پاس کھڑے رہے۔ ہوا دھیمی تھی، اور ننھے پتوں پر شام کی روشنی کھلی ہوئی تھی۔

”بڑھ رہا ہے۔“ ریحان نے پودے کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ندا نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا، ”ریحان... ٹھیک موسم میں لگائے گئے پودے ضرور پھلتے پھولتے ہیں۔“

ریحان نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک کہا — صحیح فیصلہ وہی ہے جو ہم صحیح وقت پر لے لیں۔“

دونوں واپس اندر آ گئے۔

دروازہ بند ہوا، اور بیک یارڈ میں صرف وہ پودا رہ گیا — جس کے پتوں سے اب روشنی پھسل چکی تھی۔ وہ اپنی تنہائی میں کھڑا خاموش کھڑا تھا، مگر اندر ہی اندر اپنی فطری رفتار سے مسلسل بڑھ رہا تھا۔

کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھتے ہوئے ندا کے ذہن میں جاوید کا کہا ایک جملہ دھیمی سی گونج بن کر ابھرا —

”اصل چیزیں وقت مانگتی ہیں — اور وقت میرے پاس کبھی تھا ہی نہیں۔“

خیال کی اس گونج کے رنگ پھیکے پڑتے پڑتے افق کی مدھم سنہری لکیر میں گھل گئے — اور وہ سنہری لکیر دیکھتے ہی دیکھتے رات کی گہری خاموشی میں جذب ہو گئی۔

☆☆☆☆☆

# ناقابلِ علاج

وقت مقررہ پر سجاد کینسر ہسپتال پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی اور ایک بیٹا تھے۔ جب سجاد کا چیک اپ کیا گیا اور اس کی عمر پوچھی گئی تو ڈاکٹروں نے یہ ٹھان لیا کہ سجاد کی عمر کیونکہ کینسر ہسپتال کے کرائٹیریا سے اوپر تھی، اس لیے اس کو داخل نہیں کیا جائے گا۔ یوں سمجھیے کہ کینسر ہسپتال نے سجاد کو جواب دے دیا۔

بہت دکھی ہو کر سجاد، اس کی بیوی اور اس کے بیٹے نے اپنے شہر واپس جانے کے لیے ٹرین کے ٹکٹ بک کروائے۔ لیکن عید کی چھٹیاں قریب آ چکی تھیں۔ اس لیے رش کی وجہ سے ٹکٹ پانچ دن بعد کا ہی مل سکا۔ اس لیے مجبوراً رہنا تو تھا ہی سو پانچ دن اسی ہوٹل میں قیام کیا اور بکنگ والے دن دکھی دل کے ساتھ اپنے شہر واپس چلے گئے۔

حیران کن بات یہ ہوئی کہ سجاد کی صحت دن بہ دن بہتر ہونا شروع ہو گئی۔ سب گھر والے اور خود سجاد نے بھی یہی سمجھا کہ اسے جو کینسر ہسپتال والوں نے ابتدائی طور پر دوائیاں دی تھیں، انہی کی وجہ سے اس کا کینسر ٹھیک ہونا شروع ہو گیا ہے۔

کینسر ہسپتال جانے سے پہلے جس حکیم صاحب سے سجاد کا علاج ہوتا رہا تھا، سجاد کے بیٹے نے جب اس کی صحت میں بہتری کے بارے میں بتایا تو وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا:

”شاید اللہ کے ہاں تم لوگوں کی سن لی گئی ہے۔ شاید سجاد کے ہاتھ کا دیا ہوا صدقہ کام آ گیا۔ کل میں آپ لوگوں کے گھر آؤں گا۔“ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ مریض مطب پر جاتا ہے، لیکن اس بار حکیم صاحب کو اتنی حیرت ہوئی تھی کہ وہ مریض کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے بہت سارے سوال کیے۔ جن میں سے ایک سوال یہ تھا:

”سجاد کو کھانے میں کیا دیا جا رہا ہے؟“ تو سجاد کی بیوی سعدیہ نے جواب دیا:

”ہم کینسر ہسپتال کے پاس ایک ہوٹل پر ٹھہرے تھے وہاں ساتھ ہی ایک ریسٹورنٹ سے کھانا لاتے تھے۔ سجاد زیادہ نہیں کچھ بس تھوڑے سے کباب کھا لیتے تھے۔“

حکیم صاحب: ”کون سے کباب تھے“؟

سعدیہ: ”وہ جو سیخ کباب ہوتے ہیں ہم انھیں وہ کھلاتے تھے۔“

حکیم صاحب کا شک، یقین میں بدلنا شروع ہو

صغیر احمد صغیر

گیا، جو وہ دل ہی دل میں لے کر آئے تھے۔
دراصل حکیم صاحب کے ذہن میں سجاد کے مرض کے کامیاب علاج کے لیے ایک نسخہ تھا جو بنانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس نسخے کے مطابق سجاد کو ایک خاص recipe کے کباب کھلائے جانا لازم تھا۔ لیکن جس وقت سعدیہ نے حکیم صاحب کو بتایا کہ سجاد کو کباب کھلائے گئے تھے، تو ان کے ذہن میں کڑیوں سے کڑیاں ملنا شروع ہوگئیں۔
حکیم صاحب کئی سوالات دل میں لیے واپس گھر چلے گئے اور اگلے دن وہ اسی کینسر ہسپتال کے قریب والے ہوٹل میں قیام پذیر ہوگئے۔
حکیم صاحب ہوٹل کے قریب ریسٹورنٹ سے کباب لاتے اور کھانے کے بجائے ان کو کمرے میں دیے گئے ریفریجریٹر کے اوپر والے خانے میں جمع کرتے گئے۔ چندون کے بعد حکیم صاحب نے کافی سارا کباب کا میٹریل اکٹھا کیا اور ایک یورپی ملک چلے گئے۔ وہاں جا کر انھوں نے ان کبابوں کا جو میٹریل تھا، اس کے بارے میں جاننا چاہا اور ایک مشہور لیب میں انھوں نے وہ میٹریل پیش کیا کہ اس کا لیبارٹری ٹیسٹ کر کے بتایا جائے کہ یہ گوشت کس جانور کا ہے۔ انھوں نے جو میٹریل لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے دیا، اس میں سے کافی سارا میٹریل ان کے پاس موجود تھا۔ وہاں جب ان کو کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، تو وہ ایک اور یورپی ملک چلے گئے جہاں آلات بہت زیادہ سینسٹو اور تھے اور ایک لیب میں انھوں نے جو میٹریل دیا، وہاں پر یہ ثابت ہوگیا کہ جو حکیم صاحب کا شک تھا وہ یقین میں بدل چکا ہے۔
لیبارٹری میں حکیم صاحب کئی گھنٹے سے رپورٹ کا انتظار کر رہے تھے۔
آخر کار ایک سفید کوٹ پہنے ماہر ان کے سامنے آ کر رک گیا۔
اس کے ہاتھ میں رپورٹ تھی۔
وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا:
”آپ کو یقین ہے کہ یہ نمونہ سیخ کباب کا ہے؟“
حکیم صاحب نے بے قراری سے سر ہلایا۔
”جی۔ میں نے خود کلیکشن کی ہے۔“
ماہر نے رپورٹ میز پر رکھ دی۔
”تو پھر آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس میں کسی معلوم جانور کا مکمل DNA نہیں ہے۔“
حکیم صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔
”کیا مطلب؟“
”مطلب یہ کہ اس میں انسانی DNA کے واضح شواہد موجود ہیں۔“
حکیم صاحب کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔
ان کے ذہن میں سجاد کا چہرہ آیا۔
کانوں میں سعدیہ کے الفاظ کی گونج سنائی دی:
”ہم نے تو انھیں سیخ کباب ہی کھلائے تھے۔“
وہ کچھ دیر تک رپورٹ کو دیکھتے رہے، پھر اچانک پوچھا:
”کیا آپ سو فیصد یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ انسانی گوشت ہے؟“
ماہر نے جواب دینے کے بجائے دوسری

رپورٹ ان کے سامنے رکھ دی۔
"یہ صرف انسانی DNA نہیں ہے۔"
حکیم صاحب نے رپورٹ اٹھائی۔
اس بار ان کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔
رپورٹ کے آخری حصے میں ایک جملہ درج تھا:

"The DNA profile is consistent with a living human blood."

حکیم صاحب کی سانس رک گئی۔

"Living?"

ماہر نے سر ہلایا۔
"جی۔ نمونے میں موجود DNA کسی مردہ شخص کے عام degraded tissue جیسا نہیں۔ پروفائل غیر معمولی طور پر محفوظ ہے۔"
حکیم صاحب کے ذہن میں ایک اور خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔
انھوں نے فوراً کینسر ہسپتال کے قریب اسی ہوٹل کا نمبر ملایا۔
کافی دیر بعد فون اٹھایا گیا۔
"جی، فلاں ہوٹل؟"
حکیم صاحب نے پوچھا:
"آپ کے ہاں سیخ کباب کون بناتا ہے؟"
دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔
پھر جواب آیا:
"وہ تو باہر سے آتے ہیں۔"
"کہاں سے؟"
اس بار خاموشی کچھ زیادہ طویل تھی۔
پھر دھیمی آواز آئی:
"صاحب... آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟"
حکیم صاحب نے فون بند کر دیا۔
اسی لمحے ان کے موبائل پر سعدیہ کا پیغام آیا:
"حکیم صاحب! سجاد کی طبیعت بہت بہتر ہے۔ آج ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ان کا ٹیومر حیرت انگیز طور پر سکڑ رہا ہے۔"
حکیم صاحب نے موبائل کی اسکرین کو دیکھا۔
پھر ان کی نظر لیبارٹری کی رپورٹ پر پڑی۔
ان کے ذہن میں ایک خوفناک سوال پیدا ہوا:
اگر سجاد کو واقعی انسانی خون سے آلودہ کباب کھلایا گیا تھا..
تو خون کس انسان کا؟
اور پھر اس سے بھی زیادہ خوفناک سوال:
اگر وہ گوشت کسی مردہ انسان کا نہیں تھا، تو وہ انسان اب کہاں تھا؟
حکیم صاحب نے رپورٹ تہہ کی، جیب میں رکھی اور کھڑکی سے باہر برف کو دیکھتے رہے۔
اگلی صبح جب انھوں نے سجاد کو فون کیا تو سعدیہ نے فون اٹھایا۔
"حکیم صاحب! سجاد آپ سے بات نہیں کر سکتے۔"
"کیوں؟"
کچھ لمحے خاموشی رہی۔
پھر سعدیہ کی آواز آئی:
"وہ ابھی کباب کھا رہے ہیں۔"
فون حکیم صاحب کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

☆☆☆☆☆

# دلہن بھابی

لاؤنج بھانت بھانت کے مہمانوں سے بھرا تھا۔ مختلف آوازیں، بچوں کی ریں ریں، قہقہے گپ شپ، ملا جلا ماحول تھا۔

ایسے میں دلہن بنی صدف کب سے اس ماحول کا حصہ بنی بیٹھی تھی۔ اب اس کا جی متلانے لگا تھا۔ بھاری جوڑا، زیورات، موسم اگرچہ نارمل ہی تھا۔ اسے عادت نہ تھی، تھکن کا احساس شدید تر ہوگیا تھا۔

کافی دیر ہوگئی تھی۔ رسمیں بھی انجام پزیر ہوگئیں۔ اب وہ ریلیکس کرنا چاہتی تھی، مگر آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ اس کا دولہا شکیل بھی کچھ دیر بیٹھنے اور رسمیں مکمل ہونے کے بعد جا چکا تھا۔ مگر وہ ہنوز بے بس بیٹھی تھی۔

ارے بھئی بس کرو۔ دلہن تھک گئی ہوگی، اسے کمرے میں لے جاؤ، غالباً یہ شکیل کی اکلوتی پھوپھو کی آواز تھی۔

صدف کی ساس نصرت کے ہمراہ ایک دوبار اُس کے گھر آئی تھیں

جی امی_ میں لے جاتی ہوں۔ ایک آواز آئی، یہ ناز تھی شکیل کی اکلوتی پھوپھو کی اکلوتی بیٹی۔ جو صدف کے پاس آکر مسکرا کر اُسے اٹھانے لگی۔

ابھی رُکیں ناز باجی۔ سارہ نہیں آئی ابھی تک، وہ چینج کرکے آرہی ہے۔ ایک آواز نے ناز کے ہاتھ روک دیئے جو اسے تھام کے اُٹھانے کو تیار تھے۔

اچھا_ کئی آوازیں بیک وقت اُبھریں۔

سارہ نے کہا ہے کہ وہ دلہن بھابی کو اُن کے کمرے میں لے کر جائے گی۔

صدف کی ساس نصرت کی محبت بھری آواز آئی۔

ارے__لو__وہ آگئی، ایک نعرہ بلند ہوا۔

صدف دیکھ نہ سکتی تھی، مگر محسوس کرسکتی تھی۔

آداب دلہن بھابی۔ مہین اور چاہت بھری آواز پر صدف نے جھکی نظریں ذرا سی اُٹھائیں۔

پُرخلوص مسکراتے چہرے والی سولہ سترہ سالہ آنکھوں میں احترام لیے اسے تھامنے کو بے قرار تھی، کون تھی یہ صدف کچھ سمجھ نہ پائی ویسے بھی غیروں میں رشتہ ہوا تھا، تو واقفیت ہونے میں کچھ وقت درکار تھا۔

آیئے دلہن بھابی۔ اس سارہ نامی لڑکی نے

فصیحہ آصف خان

اسے کانچ کی گڑیا کی طرح اسے اُٹھایا
دوسری جانب ناز اسے آہستہ آہستہ قدم
اٹھانے کا کہہ کر کمرے میں پہنچا دیا۔
بسم اللہ...... ناز نے محبت سے اسے حجلۂ عروسی
میں داخل، ستارہ بھی ہمراہ تھی۔ اسے سجی
سجائی سیج پر بٹھا کر اس کا دوپٹہ اور لہنگا
درست کرنے لگی۔
سارہ قریب کھڑی دیکھتی رہی کہ ناز فارغ
ہو کر بولی - یہ سارہ ہے۔ ہمارے ابو کے
کزن رفیق ماموں کی بیٹی۔ صدف نے ناز
کے تعارف پر محض سرسری سا سر ہلا دیا۔
دونوں کے جانے کے بعد تھوڑی دیر دولہا
میاں کی آمد ہوئی۔ یوں رات اپنی رنگینیوں
سمت تمام ہوئی۔
شکیل اور جمیل دو ہی بھائی تھے۔ بہن کوئی
نہیں تھی۔ جمیل ابھی یونیورسٹی کا طالب علم
تھا جبکہ شکیل کو تعلیم مکمل کرتے ہی اچھی
نوکری مل گئی۔ ان کے والد صاحب کا سال
پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ مختصر گھرانہ دیکھ کر
صدف کے والدین نے رشتہ طے کر دیا۔
صدف کی ساس نصرت اچھی رکھ رکھاؤ والی
سلجھی ہوئی خاتون تھی، یوں رشتہ کرانے
والی نے صدف اور شکیل کا بندھن کرا دیا۔
صدف بھی بی اے کی ڈگری لے کر فارغ
ہوئی تھی۔ وہ یونیورسٹی جانے کا سوچ رہی تھی
کہ شادی جیسے مقدس رشتے میں بندھ گئی۔
وہ خوش تھی کہ سب بحسن و خوبی انجام پا گیا۔
ولیمے کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔
اکلوتی پھوپھو دوسرے شہر رہتی تھی۔ وہاں بھی
دعوت ہوئی اب آج سارہ کے گھر رات
کے کھانے کی دعوت تھی۔
نصرت نے اسے صبح ہی بتا دیا تھا۔ سارہ کے
گھر اس کے بڑے بھائی احمد، بھابی عینی
ان کا 2 سال کا بیٹا مون اور والدہ تھیں۔
سارہ کے والد وفات پا چکے تھے۔ سارہ
دسویں جماعت میں تھی سب کی لاڈلی،
معصوم اور بے ضرر سراپا محبت تھی۔
صدف نے سارہ کے گھر جانے کے لیے
گلابی کامدار سوٹ منتخب کیا۔ جس میں ملبوس
وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ شکیل کی
ستائشی نظروں نے اس کی محنت وصول کر لی
تھی۔ چاروں افراد سارہ کے گھر روانہ ہو
گئے، جو دوسری گلی میں ہی تھا۔ صدف آج
پہلی بار آئی تھی۔ نصرت نے کیک منگوا لیا
تھا۔ ان کا تپاک سے خیر مقدم ہوا۔
سارہ چہک رہی تھی۔ اس نے اپنی کیاریوں
سے موتیے کے خوشبودار پھولوں کے گجرے
اپنے ہاتھوں سے تیار کیے تھے، جو صدف اور

نصرت کی کلائیوں میں بہار دکھا رہے تھے۔
دلہن بھابی کی کلائیاں سج گئی ہیں۔ سارہ محبت اور بھولپن سے مسکرا کر بولی۔
بھئی ہماری سارہ بہن اچھی ہے، بہت ہنر مند ہے۔ شکیل اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ سبھی مسکرا رہے تھے۔ کھانے کی میز پر سارہ کے بنائے ہوئے نہایت لذیذ شامی کباب کی سب نے تعریف کی۔ آخر میں فروٹ ٹرائفل نے تو جیسے مزا دوبالا کر دیا۔
نصرت نے فوراً پرس سے ہزار روپے کا نوٹ نکال کر بطور انعام سارہ کو دیے تو وہ شرما گئی اور بولی۔
آنٹی پر کیوں؟
ارے اتنی محنت کی ہے۔ مزیدار چیزیں بنائی ہیں۔ تمھاری کیا بات ہے سارہ بی بی۔
عینی بھابی نے بھی مزیدار پلاؤ اور چکن کڑاہی بنائی تھی۔ بھابی رہنے دیں۔ سارہ کی والدہ آہستگی سے بولیں تو نصرت مسکرا کر بولیں۔ یہ بچی کا انعام ہے۔
میرا اور سارہ کا معاملہ ہے۔ بس۔ نصرت نے ہنس کر کہا۔ یوں ایک سہانی شام مزیدار کھانے اور گپ شپ کے بعد تمام ہوئی۔

---

مہینے بعد نصرت نے صدف کو گھریلو کام کاج پہ لگا دیا۔ صدف اس مصروفیت سے خوش تھی۔ دونوں ساس بہو مل جل کر باورچی خانے کا کام سمیٹ لیتیں۔ جز وقتی ملازمہ صفائی کرتی، برتن دھوتی اور کپڑے دھویا کرتی تھی۔
آج انھوں نے نرگسی کوفتے بنائے تھے۔
نصرت نے ایک پیالے میں سالن نکالتے ہوئے کہا
یہ سارہ کے لیے ہے اسے نرگسی کوفتے بہت پسند ہیں۔ صدف کے اندر نا چاہتے ہوئے بھی اک ناگواری کی لہر اٹھی جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی۔
پرسوں گاجر کا حلوہ سارہ کے لیے رکھا تھا۔ اس سے پہلے چند دن قبل بریانی کی پلیٹ میں سارہ کا حصہ موجود تھا۔
صدف کو عجیب سا لگا۔
یہ ٹھیک تھا کہ ان کے گھر سے بھی کچھ نہ کچھ آجاتا تھا۔ عینی نے ہفتہ پہلے پالک گوشت کا سالن بھیجا تھا۔
سارہ پڑھ رہی تھی سوچا خود ہی دے آؤں۔
عینی مسکراتے ہوئے پیالہ صدف کو تھماتے ہوئے مسکرا کر بولی۔
صدف نے نوٹس کیا کہ سارہ کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔
کیوں۔ بچی سمجھ کر؟
صدف نے سوچا اور سر جھٹک دیا

پھر آنے والے دنوں میں یہ سلسلہ دراز ہو گیا۔ ہوتا گیا۔ صدف کو کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ شکیل اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ جمیل بھی اس کے لیے دہی بھلے یا آئس کریم لے آتا۔ مگر سارہ کا حصہ اس میں بھی الگ ہوتا تھا۔ جمیل دروازہ بجا کر باہر سے ہی اُسے دے آتا تھا۔

صدف بلاوجہ جلن اور حسد کا شکار ہونے لگی تھی۔ حالانکہ وہ ایسی نہ تھی نہ اس کی ضروریات سے کچھ کم ہو رہا تھا مگر اندر ہی اندر وہ کھولن کا شکار تھی۔

---

نصرت کے ساتھ وہ بدلتے موسم کے لباس خریدنے مارکیٹ آئی ہوئی تھی۔ خوب صورت رنگدار برینڈڈ کپڑوں کی بہار تھی۔

تین تین سوٹ ساس بہو نے پسند کیے۔

یہ سارہ کے لیے کیسا رہے گا، نصرت نے اچانک ہی ایک ہلکے جامنی رنگ کے سوٹ کو ہاتھ میں لے کر صدف سے پوچھا۔

صدی کے اندر کڑواہٹ اُتر گئی۔

یہاں بھی سارہ۔ وہ سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

جی۔ اچھا ہے۔ وہ مختصر بول کر باقی کپڑے دیکھنے لگی۔

یوں نصرت نے مزید دو سوٹ لیے، سارہ کی والدہ اور چچی کے لیے۔ صدف پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

ہر معاملے میں سارہ، ہر جگہ سارہ......

پھر جیولری اور نفیس سا ہینڈ بیگ بھی سارہ کے لیے لیا گیا۔

صدف کے اندر قوت برداشت کم ہو رہی تھی، آخر کار وہ بول اُٹھی۔ سارہ کے لیے یہ سب کیوں؟ اُس کے انداز و لہجے کی ناگواری ساس کو بخوبی محسوس ہوئی۔

وہ مسکرا کر بولیں۔ یتیم بچی ہے، میری گودوں میں کھیلی ہے۔ اسے بیٹی کی طرح سمجھتی ہوں اس کی سالگرہ آ رہی ہے ناں۔ کیوں نہ اسے تحائف دیے جائیں۔ میں ہمیشہ ہی اس کا اس طرح خیال رکھتی ہوں۔

صدف ان کے طویل جواب پر سوائے خاموش رہنے کے کیا کر سکتی تھی؟

---

دو، دن بعد سارہ کی سالگرہ تھی سبھی کو یاد تھی۔ صدف حیران تھی شکیل اور جمیل ہر سال کی طرح اپنے ہی گھر میں منعقد کر رہے تھے۔

یہ انکشاف بھی صدف پہ اب ہوا تھا۔

وہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔

مگر خاموش رہنے میں ہی عافیت تھی۔

بڑا سا کیک منگوایا گیا۔ کمرے کو مناسب انداز میں سادہ سے سجایا گیا۔ رات شکیل اسے مارکیٹ لے گئے کہ سارہ کے لیے تحفہ خریدیں نا چار اسے جانا پڑا۔

سنہرے رنگ کا چمکدار ریڈی میڈ سوٹ چمکدار کھلا کھلا سا۔ خوب صورت اور نفیس کڑھائی سے مزین۔

صدف اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ اب سارہ وہی سوٹ پہنے کھلکھلاتی ہوئی، ہلکے میک اپ میں، جیولری اور خوب صورت جوتے پہنے پری لگ رہی تھی۔

اللہ اس بچی کو نظرِ بد سے بچائے۔ نصرت کی آواز میں محبت ہی محبت تھی گپ شپ کرتے، کھاتے پیتے وقت گزر گیا۔

جمیل نے اسے پرفیوم اور پھولوں کے بکے دیا، سارہ سب کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ سارہ کی والدہ اور بھابی بھی اور بھائی بھی خوشی سے نہال تھے۔

یوں ایک مسکراتی شام اختتام پزیر ہوئی۔

---

کافی دنوں سے سارہ نہیں آئی تھی۔

پتہ نہیں کیا بات ہے؟ آخر کار صدف نصرت سے کہہ اٹھی۔

اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اداسی سے بولی تھیں۔

کیا ہوا ہے اسے؟ صدف اندرونی خوشی چھپا کر سرسری انداز میں پوچھ بیٹھی۔

اچھا__ اتنا کہہ کر وہ باورچی خانے میں آ گئی۔

پھر آنے والے دنوں میں سارہ کی طبیعت اکثر و بیشتر خراب رہنے لگی تھی۔ پڑھائی بھی اسکی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ نصرت اس کے بارے میں فکرمند دکھائی دیتی تھیں۔ انہی دنوں صدف کو اللہ تعالیٰ نے بڑی خوشی سے نواز دیا۔

وہ ماں بننے والی تھی۔ پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ساس سب بھول کر اس کی دیکھ بھال میں لگ گئیں۔

سارہ کہیں پسِ منظر میں چلی گئی تھی۔ ابھی باقی افراد سے یہ خوشی چھپائی جا رہی تھی۔ نصرت کبھی کبھار سارہ کی طرف چلی جاتی تھیں۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ اس شام سارہ اپنی والدہ کی ہمراہی میں آ گئی جسمانی طور پر وہ بے حد کمزور اور رنگت زرد دکھائی دی۔

حالانکہ علاج جاری تھا۔ صدف نے کبھی ضرورت بھی محسوس نہ کی کہ اس کی بیماری کی تفصیل دریافت کرتی۔ نہ اسے دلچسپی تھی۔ نہ گھر میں کسی نے کہا کہ اسے سارہ کی ہسٹری بارے بتائیں۔

نصرت بے حد محبت سے ملیں ہمیشہ کی طرح پھر اپنی مصروفیات کا تذکرہ کیا۔ اور انھیں صدف کی خوشخبری سنا دی۔

دونوں بہت خوشی ہوئیں اور دعائیں دینے لگیں۔

دلہن بھابی میں آپ کے لیے ایک سرپرائز تیار کر رہی ہوں دعا کریں جلدی بن جائے۔ سارہ محبت بھری نقاہت سے بولی تھی۔

تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مت تکلیف کرو، صدف نے آخرکار کہہ دیا۔ نہیں _ نہیں دلہن بھابی۔ یہ میری بہت بڑی آرزو ہے۔ سارہ نے جوس پیتے ہوئے ہنس کر کہا۔

اچھا جیسی تمھاری مرضی۔ جو تمھارا دل چاہے۔ صدف کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

سارہ کی آنکھیں ''دل'' کے لفظ پر بھر آئیں مگر اس نے نمی اپنے اندر اتار لی۔

ماں بیٹی کچھ دیر رکنے کے بعد چلی گئی۔ نصرت نے انھیں کھانے پہ بہت روکا، مگر کام کا بہانہ کرکے چلی گئیں۔

گھر آکر سارہ اپنے کام میں لگ گئی۔ وہ جلد از جلد اس سرپرائز کو مکمل کرنا چاہتی تھی بار، بار اسے دیکھتی اور خوش ہوتی۔

آخرِکار دو، دنوں بعد وہ سرپرائز مکمل ہو گیا۔ اس نے ماں اور بھابی کو دکھایا پھر خوب صورت انداز میں اسے پیک کرکے رکھ دیا۔

سب جانتے تھے کہ یہ صدف کے لیے بنا رہی ہے۔ ماں نے خوش ہو کر اسے دعا دی۔ امی کل جا کر دلہن بھابی کو دے آئیں گے۔ سارہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔

ہاں، ہاں کیوں نہیں، میری بیٹی نے اتنی محنت اور محبت سے تیار کیا ہے۔ صدف کو بہت اچھا لگے گا۔ ماں نے اسے خوشی سے گلے لگا لیا، اور آنکھیں نم کر بیٹھیں، عینی نے آج پلاؤ پکایا۔ پلیٹ میں چاول ڈالے۔ اپنا سرپرائز سنبھالے وہ ماں کے ساتھ نصرت کے گھر آئیں۔

ارے واہ۔ پلاؤ۔ صدف سچ میں خوش ہوئی۔ اور پلیٹ تھام کر نصرت نے محبت سے سارہ کو پیار کیا۔

آج چھٹی تھی۔ شکیل اور جمیل بھی گھر پہ تھے کہ سارہ نے سب کے سامنے اپنا سرپرائز کھولا۔

یہ میں نے دلہن بھابی کے لیے بنایا ہے، سوچا تھا شادی پر دوں گی مگر طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ یہ کل ہی مکمل ہوا ہے یہ دیکھیں دلہن بھابی۔ اچھا ہے ناں۔ معصوم سی سارہ پلکیں جھکا کر پوچھ رہی تھیں۔

صدف کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں گلابی خوب صورت بے حد نفیس دوپٹہ، اس پر ستاروں کی چمک دمک اور رنگدار چمکیلی بیلوں نے بہار کے رنگ بکھیرے ہوئے تھے۔ ایک ایک ٹانکہ نفاست لیے ہوئے تھا۔ گویا کائنات زمین پہ اتر آئی ہو اتنا خوب صورت۔ صدف کے منہ سے حیرانی سے نکلا

سارہ نے دوپٹہ صدف کے اوپر ڈال کر اوڑھا دیا۔

صدف کا حسن مزید نکھر گیا۔

اسے دل وجاں سے سارہ کی کاوش پسند آئی تھی۔

بہت پیارا ہے۔ دلکش اور دلفریب۔ تم نے کتنی محنت سے تیار کیا ہے۔ طبیعت بھی اچھی نہیں تھی۔ صدف کے دل میں سارہ کے لیے محبت ہی محبت اُتر آئی تھی۔ خود کو کوستے ہوئے وہ خوشی سے بولی۔

حسین بن گیا دلہن بھابی۔ آپ کو یاد رہے گا۔

جانے سارہ کے لہجے میں کیا تھا۔ اداسی، مایوسی، بے بسی، دُکھ، حسرت، جسے تمام افراد نے محسوس کیا۔ نہ سمجھی تو صدف کچھ نہ سمجھ سکی۔

شکیل نے خاص طور پر اس کا شکریہ ادا کیا اور سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ جمیل آئس کریم لے آیا تھا۔ سب مل کر کھانے لگے وقت بیت گیا صدف نے دوپٹہ تہہ کر کے لفافے میں رکھا۔ اور چیزیں سمیٹ کر کمرے میں آ گئی۔ وہ بس اپنی خوشی میں خوش تھی۔ ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ سو دل کے آس پاس کسی بات کا گزر ہی نہ ہوا۔ جو اسے پریشانی یا وسوسے میں مبتلا کرتی۔

---

اگلی شام، بس چوبیس گھنٹے ہی گزرے تھے کہ سارہ کی موت کی خبر نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔

کیا۔ وہ چیخ مار کر نصرت کے گلے جا لگی۔

یہ کیسے ہو گیا؟ امی۔ سارہ کو کیا ہوا تھا کیا تھا؟

صدف ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ آنسو تھم نہ رہے تھے۔ اس کے دل میں سوراخ تھا ڈاکٹر مایوس تھے، ہمیں معلوم تھا۔ تمھیں نہیں بتایا تھا کہ تم اس حالت میں ہو کوئی پریشانی دل پہ لو بس اس بچی کی زندگی ہی اتنی تھی۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔ بڑی جی داری اور حوصلے سے اپنی بیماری کا مقابلہ کرتی رہی۔ اللہ اس کی آخری منزل آسانی عطا فرمائے۔ جنت مکین ہو۔ آمین نصرت سسک کر بولیں۔

آؤ۔ چلیں۔ سارہ کو آخری بار دیکھ لیں۔

صدف بجھے دل کے ساتھ نصرت کے ساتھ چادر اوڑھے سارہ کی طرف چل دی۔

”آپکو میرا تحفہ یاد رہے گا دلہن بھابی، بہت ”دل“ سے بنایا ہے۔

صدف کے کانوں میں سارہ کی آواز گونجی جس میں حسرت اور بے بسی تھی اب سارہ کو ابدی نیند سوتا دیکھ کر صدف کی ہچکیاں بند گئیں۔

کتنی معصوم اور خوب صورت لگ رہی تھی۔

بے ریا معصوم و بے غرض چہرہ۔ پُرسکون سا۔ جیسے کسی بہت بڑے بوجھ سے آزاد ہو گئی ہو۔

☆☆☆☆☆

# پاکیزہ عرف پنکی

کھلیان میں کھیتوں سے کٹ کر آئی گیہوں کی بالیوں کا چھوٹا بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا، اُس میں بڑا بھائی عبدل اور اُس کی چھوٹی بہن پاکیزہ پکڑم پکڑائی کے کھیل میں مگن تھے، اُن میں سے کوئی ایک درخت کی جانب منہ کرتا اور آنکھیں بند کر کے گنتی گننے لگتا، جب کہ دوسرا اس دوران لگی ڈھیریوں میں سے کسی ایک کے پیچھے جا کر چھپ جاتا، دس تک گنتی مکمل کرتے ہی پہلا دوسرے کو ڈھونڈنے لگتا، اب پکڑا جانے والا یہی طرزِ عمل دُھراتا، یہ کھیل کھیلتے کھیلتے جب دونوں تھک گئے تو پاکیزہ نے عبدل کا ہاتھ پکڑا اور اُس کے زیرِ سایہ گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔

دونوں بہن بھائیوں کی آپس میں بڑی محبت تھی، وہ ایک دوسرے پر اپنی جان میں چھڑکتے تھے، دونوں پر جب جوانی آئی تو محلّے کا ایک لفنگا شیدا پاکیزہ پر مرمٹا، وہ کبھی حیلے بہانے سے اُسے راستے میں روکتا، کبھی اُس سے چھیڑ خانی کرتا، ایک مرتبہ تو اُس نے تاحدِ نظر کسی کو نہ دیکھ کے حد ہی کر دی اور وہ اُس کے ساتھ زور زبردستی کرنے لگا، پاکیزہ نے غصّے میں آ کر اُس کے گال پر ایک زوردار چانٹا رسید کیا اور منہ پر تھوکتے ہوئے وہاں سے دوڑ پڑی، وہ گھر آئی اور سارا ماجرا اپنے بھائی کو سنا دیا، اُس نے ایک موٹا ڈنڈا اُٹھایا اور شیدے کے اڈے پر پہنچ کر اُسے مارنے لگا، وہاں موجود شیدے کے یاروں نے عبدل کو پکڑا اور اُسے مل کر مارنے لگے، وہ جب ادھ موا ہو گیا تو اُسے گاڑی میں ڈالا اور گھر کے باہر چھوڑ کر چلے گئے، بھائی کی حالت دیکھ کے پاکیزہ رو پڑی، پھر اُس نے ہمت سے کام لیا اور اپنے پڑوسی کی مدد سے بھائی کو قریبی ہسپتال لے گئی، وہاں اُس کی کٹی پھٹی جلد سلوائی، زخموں پر مرہم لگوایا اور پٹی کروا کر اُسے گھر لے آئی۔

شیدا اور اُس کے یاروں کو عبدل پر اتنا ظلم و ستم کرنے پر بھی سکون نہیں آیا، ایک رات

شکیل احمد خان

سب مل کر اپنے انتقام کی آگ بجھانے اُس کے گھر پہنچے اور بہن بھائی کو اغوا کر کے اپنے اڈے پر لے آئے، پھر۔۔۔

------------

سارے علاقے میں پنکی کا بول بالا تھا، اُس کی پوش ایریے میں بنی کوٹھی پر بڑے بڑے سیاسی، مذہبی، انتظامی، قانونی اور تجارتی سورما منہ مانگی رقم کے عوض پنکی کی قدم بوسی کرنے، دم بھرنے اور چوما چاٹی کرنے آتے تھے، یہ دھندا عرصے سے شیدے کی سرکردگی میں چل رہا تھا، کوئی دوسری وحشیہ کسی اور شہر سے یہاں آ کے جسم فروشی کی کوشش کرتی، تو شیدا اپنے بندوں سے بول کر اُسے مروا دیتا یا کسی کیس میں اندر کروا دیتا تھا، اسی طرح دونوں کی کوکین کی تجارت میں بھی قانون والوں کے ساتھ مل کر خوب کمائی ہو رہی تھی، وہ دونوں جنس والے کارندوں کے ذریعے تعلیمی درس گاہوں، پوش علاقے کی بڑی بڑی فیملی کے گھروں اور ہوٹلوں میں منشیات سپلائی کرتے تھے، اُن کے دونوں نیٹ ورکوں کا کاروبار بڑے منظم طریقے سے کامیابی کا زینہ چڑھ رہا تھا، کسی میں مجال نہیں تھی کہ وہ ان کو روک سکے، کئی پارساؤں نے جرأت سے کام لیتے ہوئے روکنے کی اگر سعی بھی کی تو اُنہیں بہت کچھ اپنے ہاتھ سے دھونا پڑا تھا اور وہ شرمندہ ہو کے ایسا کرنے سے باز آئے۔

------------

پنکی نے شیدے کو ساتھ لیا اور ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہو گئی، آج رات کی فلائٹ سے اُس کی صاحبزادی ثقیبہ عرف سرخی نیدرلینڈ سے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس اپنے وطن آ رہی تھی، ماں کی توجہ نہ ملنے اور پڑھائی میں کند ہونے کے باعث اُسے بچپن سے پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا، اُس نے جیسے تیسے اور سفارش کے بل بوتے پر انٹر تو کر لیا، لیکن آگے پڑھنے میں کوئی دل چسپی نہیں دکھائی، ماں نے اپنے ماحول کو دیکھتے ہوئے اُسے تعلیم کی غرض سے نیدرلینڈ بھیج دیا، وہاں بھی وہ پڑھنے سے معذور رہی، اب اُس کی راتیں کلبوں میں اور دن دوستوں کے ساتھ انجوائے اور سیر و تفریح میں گزرتے تھے، مجبور ہو کر پنکی نے اُسے واپس بلا لیا۔

قریباً دو بجے ثقیبہ منی اسکرٹ اور بڑے گلے کی شرٹ میں ملبوس ایئر پورٹ سے نکلی، پنکی نے ماں ہونے کے ناتے فرط جذبات میں آ کر بیٹی کو اپنے سینے سے لگا لیا، پھر اُس کے گالوں اور ماتھے پر کئی بوسے دیے، سرخی نے بھی اپنے جذبات کا اظہار اسی انداز میں کیا، ماں کے بعد اُس نے شیدے کو

سلام کیا اور حال چال پوچھا، زبان پر جواب تو تھے مگر اُس کی گندی نظریں سرخی کے فراخ شرٹ سے جھانکتے ابھاروں پر تھیں، پنکی اسے نظر انداز کرتے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھ گئی، پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر اپنی منزل کے لیے روانہ ہوگئے۔

---

شقیبہ کی جوانی جس ماحول میں گزری تھی، اُسی کے زیر اثر اُس نے شہری امراٗ کے نوجوانوں سے دوستی، جو مرد و زن کی تفریق سے عاری تھی، گانٹھنا شروع کردی، اپنی ماں کے علم میں لائے بغیر وہ شیدے سے ملی اور اُس سے نائٹ کلب کھولنے کی غرض سے تعاون مانگا، وہ تو خود ایسے کاموں میں بے پناہ رغبت رکھتا تھا، فوراً مان گیا اور اُس میں عیش عشرت کے ہر حربے کا انتظام کردیا، صرف یہی نہیں اُس نے ملک بھر کی عظیم رقاصائیں اور جسم فروش لاچھوڑیں اور اُسے مزید سنوار دیا، اُس میں علاوہ نابالغ کے تینوں جنسوں کے افراد کی آمد پر کسی طرح کی پابندی نہیں تھی، ایسی بہترین سہولیات کی وجہ سے نائٹ کلب بہت جلد اپنے عروج پر پہنچ گیا، سرخی کب باز آنے والی تھی، وہ بھی موقع محل دیکھ کر فایدہ اُٹھانے لگی، اُسے کلب میں جب کوئی ہینڈسم نوجوان یا اڈھیڑ عمر کا بوڑھا بھا جاتا، تو وہ اُس سے اپنی جسمانی پیاس بجھاتی، وہ یہ کام اپنی منا سے چھپ کر کرتی تھی۔

پنکی کا کلب کے معاملات میں زیادہ رجحان نہیں تھا، لیکن لوگوں سے جو سنتی تھی، اُس پر کچھ بولنے سے گریزاں رہی، پر بیٹی اور شیدے کو اُس نے کلب کامیابی سے چلانے پر داد دینے گریز نہیں کیا، وہ اُن کے درمیان بڑھتی پینگیں، چلتے جام اور برانگیختہ جذبات دیکھ کر اپنے دل میں خوشی محسوس کرتی تھی، اُس نے ماضی میں جس مقصد کے لیے اپنے قدم اُٹھائے تھے، اُن کا سفر اب کامیابی کی جانب گامزن تھا۔

شہر کے نئے منتخب ہونے والے ایم این اے نے اپنی کامیابی پر ایک فارم ہاؤس میں ایک پرتکلف تقریب کا اہتمام کیا تھا، جس میں شہر کے خاص خاص معززین اور مقربین مدعو تھے، ان میں پنکی اور شیدے کا شمار بھی تھا، وہ دونوں تیار ہو کر اپنے گارڈ کے ہم راہ فارم ہاؤس پہنچے، گیٹ پر خود ایم این اے نے اُن کا استقبال کیا اور انہیں پہلی صف میں بٹھا کر گیا، وہاں موجود افراد نے دونوں کی بڑی آؤ بھگت کی اور آ آ کر ملے، وجہ اس کی یہ تھی کہ انہوں نے ایم این اے کی انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور بڑی رقم

نوازی تھی۔

شیدا ایک ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھنے کے بعد پنچی سے ایک ضروری کام کا کہہ کے وہاں سے چل دیا، کوٹھی پر پہنچ کر وہ سرخی کے کمرے کی طرف بڑھا، لاک چیک کرنے کی خاطر اُس نے جیسے ہی ہینڈل کو دبایا تو دروازہ کھل گیا، وہ اُسے آہستہ بند کر کے جیسے ہی پلٹا تو اُس کی نظر بیڈ پر سوئی شقیبہ پر پڑی، وہ نیند میں خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی، گلابی رنگ کے باریک خوابی لباس میں سے اُس کے گورے اور سرخی مایل اعضأ نمایاں ہو رہے تھے، انہیں دیکھ کر بڑھاپے کی جانب گامزن شیدہ تڑپ اُٹھا اور اپنے اُبلتے جذبات کے زیرِ اثر وہ اپنی جنسی تسکین کے لیے اُس پر وار کرنے ہی والا تھا کہ اچانک دروازہ ایک زوردار دھماکے سے کھلا، اُس کی آواز سے سرخی بھی اُٹھ بیٹھی اور دونوں کو اپنے کمرے میں دیکھ کے حیران رہ گئی، وہ اُس میں یہ بھی بھول گئی کہ اُس نے شب خوابی لباس پہنا ہوا ہے، کچھ دیر بعد اُسے جب اس کا احساس ہوا، تو وہ فوراً بیڈ سے اُٹھی اور نیچے پڑی چادر اُٹھا کے اپنے بدن پر لپیٹ لی۔

ذلیل کمینے، تیری یہ مجال۔ یہ کہتے ہوئے وہ غصّے میں اُس کے منہ پر طمانچے مارنے لگی۔ میری بیٹی کے ساتھ زیادتی کرنا چاہتا ہے، ظالم کہیں کے۔

شیدے کا چہرہ ضربیں کھا کھا کر سرخ ہوگیا، اُس نے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ تت -- تو کب آئی؟ تجھے تو تقریب میں چھوڑ کر آیا تھا۔

میں تیری ایک ایک رگ سے واقف ہوں کمینے، اتنے عرصے سے ساتھ رہ رہی ہوں، پھر تجھے جاننے میں مجھ سے کیسے چوک ہوسکتی ہے بھلا؟ تم جب بہانا بنا کے وہاں سے اُٹھے تھے ناں، تو میں سمجھ گئی تھی کہ تم کہاں اور کس لیے جا رہے ہو؟۔ اپنی اکھڑی سانسوں کو درست کرنے کے لیے اُس نے کچھ توقف کیا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ تیرے پیچھے میں بھی نکل کھڑی ہوئی تھی، لیکن دروازہ دوسرا استعمال کیا، تاکہ تیرے پالے ہوئے گارڈ تجھے اطلاع نہ کر دیں، پھر رکشے سے یہاں آگئی، شکر ہے رب کا، جس نے وقت پر پہنچا دیا، ورنہ بہت برا ہوتا اور خود کو کبھی معاف نہیں کرتی۔

پہلے تو تُو نے ایسے کاموں پر کبھی اعتراض نہیں کیا، آج جب میں تیری بیٹی تک پہنچا، تو تجھے اعتراض ہوگیا، یہ تو انصاف نہیں کھلا تضاد ہے۔ وہ پٹنے کے باوجود اکڑتے ہوئے بولا۔

تو اب تک جو کرتا آیا ہے، اُس پر مجھے اعتراض کیوں کر ہوگا، میرا اُن سے کیا واسطہ؟-- لیکن تیرے جیسے اوباش، لوفر اور زانی جب جسم فروش یا بگڑی عورتوں کے ساتھ زنا کرتے ہیں ناں، تو یہ بھول جاتے ہیں کہ اُن کے نطفے سے جنم لینے والی لڑکیاں یعنی بیٹیاں بازارِ حسن کی زینت بنیں گی، دھندا کریں گی، مشہور کہاوت ہے 'جو بوگے وہی کاٹو گے'-- البتہ بعض ایسی شریف النسل عورتیں بھی ہوتی ہیں، جن کی آبرو زور زبردستی لوٹ لی جاتی ہے اور وہ اُف تک نہیں کرتیں، گھر والے انھیں قبول نہیں کرتے، پھر وہ بھی مجبور ہو کے ایسے کام کرنے لگتی ہیں، اب وہ اپنا نام بدل کر جو چاہیں رکھ لیں، جیسے میرا نام پہلے پاکیزہ اور اب میں چنگی کہلاتی ہوں- یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، کچھ دیر بعد وہ پھر بولی- تو نے بیٹی پر اعتراض اُٹھایا تھا ناں، تو سن اس کی ایک ہی وجہ ہے، لیکن اس سے پہلے میں تجھے ماضی کا ایک بدترین اور صدمے سے بھرا حادثہ یاد دلانا چاہتی ہوں، یاد کر جب تو مجھے اور میرے پیارے بھائی کو اُٹھا کے اپنے اڈے پر لے گیا تھا، تیرے کہنے پر ہمیں برہنہ کر دیا گیا تھا، ہم نے شرم سے اپنے چہرے مخالف سمت میں پھیر لیے تھے، پھر تو نے بھائی جی سے وہ کام کرانا چاہا، جس کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اُن پر جب تیرا بس نہیں چلا تو تو اور تیرے یار مل کے میری عزت خاک میں ملانے لگے، کوئی بھی غیرت مند بھائی اپنے سامنے اپنی بہن کی عزت لٹتے نہیں دیکھ سکتا، بچپن میں امی صحن میں لگے ہینڈ پمپ سے جب مجھے نہلا رہی ہوتی تھیں ناں، تو بھائی جی اس لیے صحن میں نہیں آتے تھے کہ کہیں اُن کی نظر مجھ ننگی پر نہ پڑ جائے، ایسے ہوتے ہیں بھائی کمینے کتے-- اُس کی آنکھیں پھر بھر آئیں- میرے مرحوم بھائی سے یہ سب جب برداشت نہ ہوا تو انھوں نے پہرہ دینے ایک بندے سے پستول چھینی اور خود کو گولی مار لی، وہ بھیانک رات میں آج تک نہیں بھولی زانی، اُسی رات میں نے اپنے بھائی کی موت اور اپنا انتقام لینے کا خود سے عہد کیا اور آج تک اُس پر قائم رہی-- اب بیٹی کی وجہ سُن بے غیرت، میں گاہکوں کے نطفے تو دواؤں ضایع کر دیتی تھی، مگر تیرا نطفہ سنبھال کے رکھا، تاکہ تجھ اوباش کو وقت آنے پر ایک ایسا سبق سکھاؤں، جو تو ہمیشہ یاد رکھے، آج وہ وقت آگیا ہے، جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا، اگر تجھ میں برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ ہے، تو سُن-- تقیبہ عرف سرخی تیری ناجائز سگی بیٹی ہے--

☆☆☆☆☆

# دو گھنٹے......

ایئرپورٹ کی گھڑی نے ابھی ساڑھے سات بجائے تھے جب اعلان ہوا:

”مسافروں سے معذرت کے ساتھ، موسم کی خرابی کے باعث پرواز تقریباً دو گھنٹے تاخیر کا شکار ہے۔“

عمار نے بے دلی سے موبائل جیب میں رکھا اور سامنے شیشے کی دیوار سے باہر دیکھنے لگا۔

رن وے پر روشنیاں تھیں، جہاز خاموش کھڑے تھے اور مسافروں کی بے چینی پورے لاؤنج میں پھیلی ہوئی تھی۔

اسے کیا معلوم تھا کہ یہ دو گھنٹے اس کی زندگی کے پانچ برس واپس کرنے والے ہیں۔

وہی پانچ برس جنھیں وہ ہر رات اپنے دل کی کسی تاریک الماری میں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تھا۔

”عمار؟“

ایک آواز نے جیسے وقت کی گرد جھاڑ دی۔

وہ پلٹا۔

رخشندہ سامنے کھڑی تھی۔

چہرے پر وہی نرمی، آنکھوں میں وہی شرارت، ہونٹوں پر وہی ہلکی سی مسکراہٹ... مگر پانچ برس نے اس مسکراہٹ کے پیچھے ایک گہری اداسی ضرور رکھ دی تھی۔

عمار چند لمحے اسے دیکھتا رہ گیا۔

رخشندہ نے بھنویں ذرا سی اٹھائیں۔

”اتنا کیا دیکھ رہے ہو؟“

عمار کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

”گن رہا ہوں۔“

”کیا؟“

”پانچ سال --- اور دو منٹ۔“

رخشندہ کی آنکھیں بھیگنے سے پہلے ہی ہنس پڑیں۔

”تم اب بھی ایسے ہی ہو۔“

”اور تم اب بھی اتنی ہی خطرناک ہو۔“

”میں؟“

عامر عباس ناصر اعوان

''ہاں- پانچ سال بعد بھی دل کو ایک نظر میں
اپنی طرف کھینچ لینا معمولی بات نہیں۔''
رخشندہ نے نظریں چرا لیں۔
''بیٹھو گے یا صرف شاعری ہی کرتے
رہو گے؟''
دونوں ساتھ والی نشست پر بیٹھ گئے۔
عمار نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ جیسے گلے میں
پھنس گئے۔
پانچ سال کی جدائی دو منٹ میں کہاں سمٹتی
ہے؟
رخشندہ نے آہستہ سے پوچھا:
''کیسے ہو؟''
عمار ہنس دیا۔
''یہ سوال پانچ سال پہلے پوچھتیں تو شاید
جواب آسان ہوتا۔''
''اب؟''
''اب سامنے تم بیٹھی ہو، اس لیے جھوٹ
بولنا مشکل ہے۔''
رخشندہ نے پہلی بار سیدھا اس کی آنکھوں
میں دیکھا۔
''خوش نہیں تھے؟''
''تھا--- مگر مکمل نہیں تھا۔''
خاموشی اتر آئی۔
وہ خاموشی جس میں دونوں کے درمیان
گزرے ہوئے پانچ برس ایک ایک کر کے
چلنے لگے۔
کالج کی راہداری۔
بارش میں بھیگتی شام۔
چائے کا آخری کپ۔
چھوٹی چھوٹی لڑائیاں۔
روٹھنا۔
منانا۔
اور پھر وہ دن--- جب حالات نے دونوں کو
الگ راستوں پر دھکیل دیا تھا۔
رخشندہ نے دھیرے سے کہا:
''تم نے کبھی مجھے بھلایا؟''
عمار نے اس کی طرف دیکھا۔
''میں نے بہت کوشش کی۔''
''پھر؟''
''پھر ہر کوشش کے آخر میں تم ہی ملیں۔''
رخشندہ مسکرا دی۔
''جھوٹے!''
''قسم سے۔ کبھی کسی گانے میں، کبھی کسی
خوشبو میں، کبھی کسی بارش میں--- اور کبھی
کسی ایسی لڑکی میں جو تمھاری طرح بال
پیچھے نہیں کرتی تھی۔''
رخشندہ نے مصنوعی غصے سے اسے دیکھا۔
''اچھا! تو ایسی لڑکیاں بھی تھیں؟''
عمار نے فوراً ہاتھ اٹھا دیے۔
''تھیں کہاں؟ بس مثال دے رہا تھا۔''

”اچھا!“

”ویسے تم اب بھی جلتی ہو؟“

”میں؟ بالکل نہیں۔“

”تو پھر اتنی تیزی سے جواب کیوں دیا؟“

رخشندہ نے ہنس کر چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

عمار نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ پانچ برس واقعی بہت لمبے ہوتے ہیں--- مگر سچی محبت کے سامنے شاید پانچ صدیاں بھی کم پڑ جاتی ہیں۔

اچانک رخشندہ کی نظر عمار کی کلائی پر پڑی۔

”یہ گھڑی ابھی تک؟“

عمار نے کلائی دیکھی۔

”ہاں۔“

”میں نے دی تھی۔“

”اسی لیے تو ہے۔“

رخشندہ خاموش ہو گئی۔

اس کی انگلیاں بے اختیار اپنے دوپٹے کے کنارے سے کھیلنے لگیں۔

”تم نے اسے پھینکا کیوں نہیں؟“

عمار نے مسکرا کر کہا:

”جسے تم نے محبت سے دیا ہو، اسے آدمی کیسے پھینک دے؟“

رخشندہ نے دھیرے سے سر جھکا لیا۔

اسی لمحے ایک بچہ دوڑتا ہوا ان کے قریب سے گزرا اور اس کی گیند رخشندہ کے قدموں سے ٹکرا گئی۔

وہ گیند اٹھا کر بچے کو دینے لگی تو عمار نے مسکراتے ہوئے کہا:

”دیکھا؟ زندگی بھی جانتی ہے کہ تمھیں چیزیں اٹھا کر دینی ہیں۔“

رخشندہ ہنس پڑی۔

”تمھیں اب بھی ہر بات میں جملہ مل جاتا ہے؟“

”تم سامنے ہو تو ہر بات میں محبت مل جاتی ہے۔“

اعلان پھر ہوا۔

”پرواز مزید تقریباً پینتالیس منٹ تاخیر کا شکار ہے۔“

رخشندہ نے گھڑی دیکھی۔

”اب؟“

عمار نے سکون کا سانس لیا۔

”ابھی تو ہماری سزا باقی ہے۔“

”سزا؟“

”ہاں۔ پانچ سال کی جدائی کے بعد صرف دو گھنٹے کی ملاقات--- یہ تو سزا ہی ہے۔“

رخشندہ نے آہستہ سے کہا:

”کاش یہ دو گھنٹے ختم نہ ہوں۔“

عمار نے پہلی بار جواب دینے میں دیر نہیں کی۔

”کاش اس بار وقت ہماری بات مان لے۔“

وہ دونوں کافی لینے چلے گئے۔

کاؤنٹر پر رخشندہ نے پوچھا:
"اب بھی چائے؟"
"تمھارے ہاتھ کی ہو تو زندگی بھر۔"
"ایئرپورٹ کی چائے ہے۔"
"تو پھر آج سے ایئرپورٹ کی چائے بھی اچھی۔"
وہ دونوں ہنس پڑے۔
کافی کے کپ ہاتھ میں لیے واپس آئے تو رخشندہ کے ہاتھ سے ڈھکن ذرا سا پھسل گیا۔ عمار نے فوراً کپ سنبھال لیا۔
رخشندہ نے اسے دیکھا۔
"اب بھی اتنے ہی جلدی پکڑ لیتے ہو؟"
عمار نے مسکرا کر کہا:
"تمھیں گرتے ہوئے پانچ سال لگے تھے، اس بار موقع ملا تو دیر نہیں کروں گا۔"
اس جملے پر رخشندہ کی مسکراہٹ تھم گئی۔
اس نے آہستہ سے کہا:
"عمار---"
"ہم؟"
"اگر اس دن ہم جدا نہ ہوتے تو؟"
"تو شاید آج پانچ سال پرانے قصے یاد نہ کر رہے ہوتے۔"
"اور؟"
"شاید تم میری بیوی ہوتیں۔"
رخشندہ نے اسے دیکھا، پھر نظریں جھکا لیں۔
"اور اگر اب بھی---؟"
عمار کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔
"اگر اب بھی؟"
"اگر اب بھی کچھ باقی ہو تو؟"
عمار نے بہت آہستہ کہا:
"تو پھر میں باقی زندگی اسے مکمل کرنے میں لگا دوں گا۔"
رخشندہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔
اعلان ہوا:
"مسافروں سے گزارش ہے کہ اپنی پرواز کی تازہ صورت حال کے لیے اسکرین ملاحظہ کریں۔"
دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
دو گھنٹے گزر چکے تھے۔
مگر اس بار عجیب بات یہ تھی کہ دونوں کو جانے کی جلدی نہیں تھی۔
رخشندہ نے موبائل نکالا۔
"عمار۔"
"جی؟"
"میرا نمبر ابھی بھی ہے؟"
عمار نے فون نکالا۔
اسکرین پر اس کا نام پہلے ہی موجود تھا۔
رخشندہ نے دیکھا تو ہنس دی۔
"تم نے ڈیلیٹ نہیں کیا؟"
"کبھی ہمت نہیں ہوئی۔"

"پھر کال کیوں نہیں کی؟"

"ڈرتا تھا۔"

"کس سے؟"

"اس جواب سے جو شاید تم دیتیں۔"

رخشندہ نے اپنا فون اس کے سامنے رکھ دیا۔

"اب پوچھ لو۔"

عمار نے اسے دیکھا۔

"رخشندہ--- کیا تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

رخشندہ نے جواب نہیں دیا۔

بس اپنی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر مسکرا دی۔

کبھی کبھی ایک مسکراہٹ وہ جواب ہوتی ہے جس کے لیے انسان پانچ سال انتظار کرتا ہے۔

چند ہفتے بعد دونوں خاندان ملے۔

بات پکی ہو گئی۔

اور کچھ عرصے بعد اسی شہر میں، جہاں ایک دن دو گھنٹے کی تاخیر نے انھیں دوبارہ ملایا تھا، ان کی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد ایک دن رخشندہ نے شرارت سے پوچھا:

"تمھیں یاد ہے ہماری دوبارہ ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

عمار نے مسکراتے ہوئے کہا:

"جہاں ہماری فلائٹ لیٹ ہوئی تھی۔"

رخشندہ نے فوراً کہا:

"نہیں جناب!"

"پھر؟"

"جہاں ہماری زندگی وقت پر پہنچ گئی تھی۔"

عمار نے ہنس کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اور اس بار؟"

"اس بار کیا؟"

"اس بار فلائٹ لیٹ ہو تو؟"

رخشندہ نے شرارتی انداز میں کہا:

"تو دو گھنٹے اور بیٹھ جائیں گے۔"

عمار نے مسکرا کر کہا:

"دو گھنٹے؟"

"ہاں۔"

"پانچ سال نہیں۔"

رخشندہ نے اس کے کندھے سے سر ٹکا دیا۔

"اب پانچ سال کی اجازت نہیں۔"

باہر بارش ہو رہی تھی۔

وہی بارش جس میں کبھی دونوں نے جدا ہونے کا دکھ سہا تھا۔

مگر آج بارش کی ہر بوند جیسے ایک ہی بات کہہ رہی تھی:

کچھ محبتیں بچھڑتی ضرور ہیں، مگر ختم نہیں ہوتیں--- وہ صرف وقت کی کسی پرواز کے دوبارہ اڑنے کا انتظار کرتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

# خالی کرسی

''یہ کرسی خالی ہے؟'' اس نے جھک کر پوچھا۔ سامنے بیٹھے آدمی نے اخبار سے نظریں اٹھائیں، ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا اور پھر کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ''ہاں، خالی ہے۔''

وہ بیٹھ گیا۔ بس میں معمول سے زیادہ بھیڑ تھی۔ صبح کا وقت تھا اور سردی بھی ایسی کہ بس کے شیشوں پر لوگوں کی سانسیں دھند کی طرح جم رہی تھیں۔ ہر شخص اپنے اندر سمٹا ہوا تھا۔ کسی نے ہیڈ فون لگایا تھا، کوئی موبائل کی اسکرین پر انگلیاں پھیر رہا تھا اور کوئی کھڑکی سے باہر گزرتی ہوئی عمارتوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہاں اس کا کوئی بھولا ہوا ماضی رہ گیا ہو۔

وہ آدمی جس نے کرسی خالی ہونے کی اجازت دی تھی، اگلے ہی شاپ پر اُتر گیا۔

وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ چند منٹ بعد ایک بوڑھی عورت بس میں داخل ہوئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ آخرکار اس کی نظر اس کرسی پر پڑی اور وہ اس کے پاس آکر بولی!! ''بیٹا، ذرا اٹھ جاؤ، میں بیٹھ جاؤں؟''

اس نے عورت کو دیکھا اور بہت نرمی سے کہا!! ''یہ کرسی خالی نہیں ہے۔''

بوڑھی عورت نے حیرت سے کرسی کو دیکھا۔ ''مگر بیٹا، یہاں تو کوئی نہیں بیٹھا۔''

اس نے چند لمحے سوچا، پھر کہا!! ''بیٹھا تھا۔''

''کہاں گیا؟''

''اُتر گیا۔''

''تو پھر کرسی خالی ہوئی نا!''

**شاہ روم خان ولی**

اس نے سر ہلایا۔ ''نہیں، ابھی نہیں۔''

بوڑھی عورت نے اسے چند لمحے غور سے دیکھا۔ شاید اسے اس آدمی کے چہرے پر کوئی ایسی چیز نظر آئی جو اسے سمجھ نہ آئی۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

کنڈکٹر آیا تو اس نے ٹکٹ مانگا۔ اس نے ٹکٹ نکال کر دے دیا۔

کنڈکٹر نے ٹکٹ دیکھا اور پوچھا، ''آپ اکیلے ہیں؟''

اس نے فوراً کہا، ''نہیں۔''

کنڈکٹر نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ''ساتھ کون ہے؟''

اس نے برابر والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ۔''

کنڈکٹر نے خالی کرسی دیکھی، پھر اسے۔

''اس کا ٹکٹ؟''

''اس کے پاس ہے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''اگلے اسٹاپ پر اتر گیا۔''

کنڈکٹر کچھ دیر اسے گھورتا رہا، پھر بے زاری سے بولا!! ''صاحب، اگر اتر گیا ہے تو اتر گیا۔ مگر کرایہ تو دینا پڑے گا۔''

وہ مسکرایا۔۔۔ ''آپ کو بھی یقین نہیں آتا نا؟''

''کس بات کا؟''

''کہ آدمی اتر جائے تو بھی اس کی جگہ خالی نہیں ہوتی۔''

کنڈکٹر نے اسے پاگل سمجھا یا فلسفی، یہ فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے کندھے اچکائے اور آگے بڑھ گیا۔ پیچھے بیٹھے دو نوجوان ہنس پڑے۔ وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ شہر تیزی سے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اسے ہمیشہ سے یہ بات عجیب لگتی تھی کہ لوگ جگہ بدل لیتے ہیں، شہر بدل لیتے ہیں، گھر بدل لیتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے نام تک بدل لیتے ہیں مگر اپنی تنہائی ساتھ لے جاتے ہیں۔

اس کا نام فہد تھا۔۔۔ عمر بتیس برس۔۔۔ ایک نجی کمپنی میں اکاؤنٹینٹ تھا۔ تنخواہ اتنی تھی کہ گزارا ہو جاتا تھا، فلیٹ اتنا تھا کہ ایک آدمی آرام سے رہ سکتا تھا اور زندگی اتنی منظم تھی کہ اس میں کسی حادثے کی گنجائش نہیں تھی۔ صرف ایک مسئلہ تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا۔

وہ صبح اٹھتا، خود کے لیے ناشتہ بناتا، دفتر جاتا، شام کو واپس آتا، جوتے اتارتا اور دروازہ بند کرنے کے بعد چند لمحے وہیں کھڑا رہتا۔ اسے کبھی کبھی محسوس ہوتا کہ

ابھی اندر سے کوئی آواز آئے
گی۔۔ ’’آ گئے؟‘‘

مگر اندر ہمیشہ خاموشی ہوتی۔۔۔ وہ بعض
اوقات خود ہی آہستہ سے جواب
دیتا۔۔ ’’ہاں، آ گیا۔‘‘

پھر اپنی آواز سن کر ہنس دیتا۔۔ اسے اپنی
ہنسی سے بھی خوف آنے لگا تھا۔

ایک رات وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا۔
کافی دیر تک اپنے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر
اچانک بولا! ’’تم ٹھیک ہو۔‘‘

آئینے میں کھڑے آدمی نے بھی یہی کہا۔۔
وہ ہنس پڑا۔۔ ’’جھوٹ بولتے ہو۔‘‘

سامنے والا بھی ہنس رہا تھا۔۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر بولا!! ’’تم بھی
میرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔‘‘

اس رات وہ دیر تک جاگتا رہا۔

اگلے دن دفتر میں اس کے ایک ساتھی نے
منیجر سے کہا کہ فہد کچھ عرصے سے عجیب
رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ کبھی خالی
کرسی سے بات کرتا ہے، کبھی کسی کے لیے
چائے منگواتا ہے اور کبھی دفتر کی میٹنگ
میں ایسے سر ہلاتا ہے جیسے کوئی اس سے
آہستہ آہستہ بات کر رہا ہو۔

منیجر نے اسے اپنے کمرے میں
بلایا۔۔ ’’فہد، سب خیریت ہے؟‘‘

’’جی۔‘‘

’’گھر میں کوئی مسئلہ ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’کسی سے جھگڑا ہوا ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’پھر لوگ کہہ رہے ہیں کہ تم اکیلے میں کسی
سے باتیں کرتے ہو۔‘‘

فہد نے مسکرا کر کہا!! ’’لوگ بہت فارغ
ہیں۔‘‘

منیجر نے کچھ دیر اسے دیکھا۔ ’’کس سے
بات کرتے ہو؟‘‘

فہد نے جواب دینے سے پہلے کھڑکی سے
باہر دیکھا۔ ’’کبھی کبھی ان لوگوں سے جو
میرے پاس نہیں ہوتے۔‘‘

منیجر کے چہرے سے مسکراہٹ غائب
ہوگئی۔ ’’وہ تمہیں نظر آتے ہیں؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’پھر تمہیں کیسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ
موجود ہیں؟‘‘

فہد نے بڑی سادگی سے کہا!! ’’آپ اپنی
ماں کو ہر وقت دیکھتے ہیں؟‘‘

منیجر خاموش ہوگیا۔

’’پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کی ماں

ہیں نا؟"

چند دن بعد فہد کو ایک نفسیاتی معالج کے پاس بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر نے اس سے بہت سے سوال کیے - وہ ہر سوال کا جواب سکون سے دیتا رہا۔ "کیا آپ کو کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی آپ کے ساتھ موجود ہے؟"

"جی۔"

"کون؟"

"کوئی بھی۔"

"کیا وہ آپ سے بات کرتا ہے؟"

"کبھی کبھی۔"

"کیا آپ اسے دیکھ سکتے ہیں؟"

"نہیں۔"

"پھر آپ کو کیسے معلوم کہ وہ موجود ہے؟"

فہد نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا!! "کیا ہر وہ چیز جو نظر نہیں آتی، موجود نہیں ہوتی؟"

ڈاکٹر نے قلم روک دیا۔۔۔

فہد نے پھر کہا!! "مجھے محبت نہیں چاہیے، ڈاکٹر صاحب۔"

"پھر کیا چاہیے؟"

"صرف کوئی ایسا شخص جو میری بات سن لے۔"

"آپ کے دوست نہیں ہیں؟"

"ہیں۔"

"پھر ان سے بات کیوں نہیں کرتے؟"

وہ مسکرایا۔۔۔ "دوست مصروف ہوتے ہیں۔"

"خاندان؟"

"دور ہے۔"

"شادی؟"

وہ ہنس پڑا۔۔ "شادی کے لیے پہلے کسی کا ملنا ضروری ہے۔"

ڈاکٹر نے پوچھا!! "آپ کو تنہائی محسوس ہوتی ہے؟"

فہد نے پہلی بار نظریں جھکا لیں۔ "تنہائی محسوس نہیں ہوتی ڈاکٹر صاحب۔۔۔ تنہائی میرے گھر میں رہتی ہے۔"

چند دن بعد اسے ایک ذہنی صحت کے مرکز میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں ہر شخص اپنے اندر ایک الگ دنیا اٹھائے پھر رہا تھا۔ کوئی کھڑکی کے پاس کھڑا آسمان سے باتیں کرتا تھا، کوئی دیوار پر انگلی سے نام لکھتا اور مٹا دیتا، ایک بوڑھا آدمی ہر شام دروازے کے پاس کھڑا ہو کر کسی کو پکارتا تھا۔

ایک دن فہد نے اس سے پوچھا!! "آپ کس کا انتظار کرتے ہیں؟"

بوڑھے نے جواب دیا!! ”اپنے بیٹے کا۔“

”وہ کب آئے گا؟“

بوڑھا مسکرایا--- ”جب اسے یاد آئے گا کہ میں اس کا باپ ہوں۔“

فہد خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر بعد بوڑھے نے اس سے پوچھا!! ”تم کس کا انتظار کرتے ہو؟“

فہد نے جواب دیا!! ”میں کسی کا انتظار نہیں کرتا۔“

بوڑھا ہنس پڑا۔ ”پھر تم ہم سب سے زیادہ بیمار ہو۔“

فہد پہلی بار دل کھول کر ہنسا۔

وہ تقریباً تین ہفتے وہاں رہا--- ایک دن ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ وہ گھر جا سکتا ہے۔

جاتے وقت ڈاکٹر نے کہا!! ”اپنا خیال رکھیے گا۔“

فہد نے مسکرا کر کہا!! ”یہی تو مسئلہ ہے ڈاکٹر صاحب۔ اپنا خیال رکھنے والے بہت ہیں، پوچھنے والا کوئی نہیں۔“

ڈاکٹر کچھ کہنا چاہتی تھی مگر خاموش رہی۔

فہد واپس اپنے فلیٹ میں آ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ گھر بالکل ویسا ہی تھا۔ وہی میز، وہی بستر، وہی خاموش دیواریں اور سامنے رکھی ہوئی وہی دو کرسیاں---

اس نے ایک کرسی صاف کی اور دوسری کو اپنے سامنے کھینچ لیا--- پھر بیٹھ کر بولا!! ”آؤ۔“

کمرے میں خاموشی رہی۔ وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے دو کپ چائے بنائی۔ ایک کپ اپنے سامنے رکھا، دوسرا سامنے والی کرسی پر--- کافی دیر تک وہ دونوں کپ دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا!! ”آج تم بہت خاموش ہو۔“

کمرے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے خود ہی جواب دیا!! ”ناراض ہو؟“

پھر ہنس دیا--- اس رات پہلی بار اسے اپنی ہنسی اچھی نہیں لگی۔

اگلی صبح اس نے دفتر فون کر کے چھٹی لے لی--- پھر ایک دن--- پھر دو دن--- پھر وہ دفتر گیا ہی نہیں۔

پڑوسیوں نے سمجھا کہ شاید بیمار ہے۔ ایک پڑوسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ دوسرے دن بھی نہیں۔ تیسرے دن پولیس کو اطلاع دی گئی۔

دروازہ توڑا گیا۔ فہد اپنے بستر پر پڑا تھا۔ موت کئی گھنٹے پہلے ہو چکی تھی۔ کمرے میں کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھی۔ میز پر دو کپ

رکھے تھے - ایک خالی تھا - دوسرے میں چائے جمی ہوئی تھی - سامنے دو کرسیاں تھیں - ایک کرسی پر فہد کا جسم تھا - دوسری خالی---

پولیس والے نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے میز پر ایک کاغذ دیکھا - اس نے کاغذ اٹھایا - اس پر صرف چند سطریں لکھی تھیں---

"میری موت کے بعد اس کمرے سے دونوں کرسیاں باہر لے جانا - ایک وہ ہے جس پر میں بیٹھا تھا - دوسری وہ ہے جس پر میں پوری زندگی کسی کے بیٹھنے کا انتظار کرتا رہا - پہلی کرسی مجھے دے دینا - دوسری کسی ایسے آدمی کو دے دینا جو آج بھی کسی کا انتظار کر رہا ہو - شاید اسے میری طرح پاگل ہونے سے پہلے کوئی مل جائے - "

پولیس والا کچھ دیر کاغذ کو دیکھتا رہا - پھر اس نے کاغذ تہہ کیا اور جیب میں رکھ لیا -

لاش اٹھانے کے لیے دو آدمی آگے بڑھے - ایک نے خالی کرسی کی طرف دیکھ کر کہا!! "یہ بھی باہر رکھ دو - "

دوسرے نے پوچھا!! "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ آدمی چند لمحے خاموش رہا - پھر بولا!! "پتہ نہیں --- شاید کسی کو بیٹھنے کی ضرورت ہو - "

لاش باہر لے جائی گئی - کمرے میں اب صرف خاموشی رہ گئی تھی اور وہ خالی کرسی---

چند دن بعد فہد کا فلیٹ خالی کروا دیا گیا - سامان نیلام ہو گیا - میز بک گئی - بستر بک گیا - برتن بک گئے مگر وہ کرسی کسی نے نہیں خریدی--- پڑوسیوں نے اسے نیچے گلی میں رکھ دیا -

اگلے دن ایک مزدور وہاں آ کر بیٹھ گیا -

پھر ایک ڈاکیا---

پھر ایک بوڑھی عورت---

پھر ایک بچہ---

کرسی ہر آنے والے کے لیے خالی رہی مگر شاید پہلی بار وہ واقعی خالی نہیں تھی کیوں کہ جس آدمی نے زندگی بھر کسی کے بیٹھنے کا انتظار کیا تھا، اس کی تنہائی نے آخر کار ایک کرسی کو یہ سکھا دیا تھا کہ کبھی کبھی کسی کو جگہ دینا بھی محبت کی ایک شکل ہوتی ہے اور شاید فہد پاگل نہیں تھا - وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ دنیا میں کوئی ایک شخص ایسا ہو جو اس کے پاس بیٹھ کر پوچھے:

"تم ٹھیک ہو؟"

مگر دنیا کے پاس اس سوال کے لیے ہمیشہ وقت کم پڑ جاتا ہے -

☆☆☆☆☆

# دکھ ہزار

شہر پر شام اتر رہی تھی۔
وہ ایسی شام تھی جس میں سورج ڈوبنے سے پہلے ہی روشنی اپنا مقدمہ ہار جاتی ہے۔ گلیوں میں دن بھر کی گرد تیر رہی تھی اور پرانے مکانوں کی دیواروں پر دھوپ کے آخری دھبے ایسے ٹھہرے ہوئے تھے جیسے کسی نے زرد آنکھوں سے شہر کو الوداع کہا ہو۔ چھتوں پر بیٹھے کبوتر اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے، مگر کچھ پرندے ایسے بھی تھے جنھیں معلوم نہ تھا کہ ان کا گھر کس سمت ہے۔
دور مسجد کے مینارے سے مغرب کی اذان بلند ہوئی تو گلی کے کونے پر بیٹھا بوڑھا فقیر اپنی میلی چادر درست کرنے لگا۔
”اللہ کے نام پر کچھ دے دے، بابا...“
اس کی آواز میں بھیک سے زیادہ تھکن تھی۔
مگر اس روز کسی نے اسے کچھ نہ دیا۔
لوگ اپنے اپنے دکھوں میں اتنے مصروف تھے کہ کسی دوسرے کے دکھ کی آواز سننے کی فرصت کسے تھی۔
اسی گلی کے آخری سرے پر ایک پرانا سا مکان تھا۔ مکان کیا تھا، اینٹوں، نمی، شکستہ لکڑی اور یادوں کا ایک ڈھانچا تھا۔
دروازے کے اوپر کبھی نیلے رنگ سے لکھا ہوا مکان نمبر اب دھندلا چکا تھا۔ دروازے کی لکڑی جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور کنڈی ہر بار بند کرتے ہوئے ایسی آواز نکالتی جیسے کسی بوڑھے آدمی کی ہڈی چٹخی ہو۔
صحن میں نیم کا ایک بوڑھا درخت تھا، جس کی بیشتر شاخیں سوکھ چکی تھیں، مگر ہر بہار میں وہ ضدی بوڑھے کی طرح چند ہرے پتے ضرور نکال لاتا۔
مکان میں بشیر رہتا تھا۔

نعمان منظور

بشیر کی عمر کوئی پینسٹھ برس کے قریب تھی، مگر دیکھنے والا اسے ستر سے کم نہ سمجھتا۔ چہرے کی جھریاں صرف عمر کی نہیں تھیں؛ ہر جھری کے پیچھے کوئی واقعہ دفن تھا۔ آنکھیں ایسی تھیں جیسے بہت دیر تک رونے کے بعد آنسو ختم ہو گئے ہوں۔

وہ کبھی ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ تیس برس تک فائلیں ترتیب دیتا رہا، سرخ فیتے باندھتا رہا، آنے جانے والے خطوط پر تاریخیں ثبت کرتا رہا اور ہر شام اپنی جیب میں اتنی تنخواہ لے کر گھر آتا رہا جس سے گھر چلتا تو تھا، مگر خواب نہیں۔

اس کی زندگی کے دو ہی بڑے خواب تھے۔

ایک فہد۔

اور دوسرا سکینہ۔

فہد اس کا بیٹا تھا۔

سکینہ اس کی بیوی۔

سکینہ کو مرے پندرہ برس ہو چکے تھے۔

پندرہ برس ایک لمبا زمانہ ہوتا ہے۔ اتنا لمبا کہ کسی کے چہرے کے نقوش یاد رہتے ہیں مگر اس کی آواز بھولنے لگتی ہے۔ اتنا لمبا کہ کپڑوں کی خوشبو ختم ہو جاتی ہے، مگر الماری کھولنے پر دل پھر بھی دھڑکنے لگتا ہے۔

فہد بارہ برس پہلے شہر چھوڑ کر دبئی چلا گیا تھا۔ پہلے دو تین برس فون آتے رہے، پھر پیسے آنے لگے، پھر صرف عید پر پیغام، اور آخرکار پیغامات بھی کم ہو گئے۔

بشیر نے کبھی شکایت نہیں کی۔

وہ کہا کرتا تھا:

"اولاد درخت کی شاخ ہوتی ہے۔ شاخ پرندوں کے لیے ہوتی ہے، درخت کے لیے نہیں۔"

مگر رات کو جب وہ اکیلا بستر پر لیٹتا تو کبھی کبھی اس کا ہاتھ بے اختیار دوسری طرف بڑھ جاتا، جہاں برسوں اس کی بیوی سویا کرتی تھی۔

خالی جگہ ہاتھ کو ہمیشہ سچ بتا دیتی ہے۔

اس شام بھی وہ نیم کے نیچے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ سامنے چائے کا پیالہ رکھا تھا، جس سے بھاپ اٹھنا بند ہو چکی تھی۔ اس نے پیالہ اٹھایا، ایک گھونٹ لیا، پھر رکھ دیا۔

چائے ٹھنڈی تھی۔

اس نے سوچا، آج کل ہر چیز جلدی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

چائے بھی۔

رشتے بھی۔

باتیں بھی۔

اس نے نیم کے درخت کی طرف دیکھا۔

"تم بھی کب تک کھڑے رہو گے؟"

درخت خاموش رہا۔

شاید بوڑھے درخت اور بوڑھے آدمی ایک دوسرے کی زبان سمجھتے تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔
بشیر نے سر اٹھایا۔
"کون؟"
کوئی جواب نہ آیا۔
دوبارہ دستک ہوئی۔
اس نے آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کی۔
گھٹنوں میں درد تھا۔ دروازے تک پہنچنے میں اسے معمول سے زیادہ وقت لگا۔
دروازہ کھولا تو سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔
تقریباً بائیس تیئس برس کی۔
دُبلا سا جسم، خاکی شال، بکھرے بال اور آنکھوں میں ایسی گھبراہٹ جیسے وہ بہت دور سے بھاگ کر آئی ہو۔
"آپ بشیر صاحب ہیں؟"
بشیر نے اسے غور سے دیکھا۔
"ہاں۔ مگر تم کون ہو؟"
لڑکی نے ہونٹ کھولے، مگر آواز نہ نکلی۔
پھر اس نے آہستہ سے کہا:
"میں... زینب ہوں۔"
بشیر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔
"کون زینب؟"
لڑکی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک پرانا لفافہ آگے بڑھایا۔
"یہ آپ کے لیے ہے۔"
بشیر نے لفافہ لیا۔
لفافے پر اس کا نام لکھا تھا۔
لکھائی دیکھتے ہی اس کا ہاتھ کانپ گیا۔
یہ لکھائی وہ ہزار برس میں بھی پہچان سکتا تھا۔
سکینہ کی لکھائی تھی۔
وہی گول حروف۔
وہی "ب" کے نیچے ذرا سا لمبا خم۔
وہی "ش" کے آخری دانت کے بعد معمولی سا خلا۔
وہی لکھائی جس میں کبھی وہ بازار کی فہرست لکھتی تھی:
آدھا کلو آٹا۔
چوتھائی کلو دال۔
نمک۔
چینی۔
اور کبھی نیچے چھوٹے سے حاشیے میں لکھ دیتی:
"واپس آتے ہوئے گلاب بھی لیتے آئیے گا۔"
بشیر نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔
"یہ کہاں سے ملا؟"
"میرے پاس تھا۔"
"تمھارے پاس؟"
"جی۔"
"تم کون ہو؟"
زینب نے نظریں جھکا لیں۔
"یہ خط پڑھ لیں، پھر بتاؤں گی۔"
بشیر کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔
پھر ایک طرف ہٹ گیا۔

"اندر آ جاؤ۔"

زینب اندر داخل ہوئی۔

گھر میں پرانی لکڑی، مٹی اور بند کمروں کی بو تھی۔ دیوار پر ایک تصویر لٹکی تھی۔

سکینہ کی تصویر۔

زینب کی نگاہ تصویر پر پڑی تو وہ ایک لمحے کو ٹھٹک گئی۔

بشیر نے یہ دیکھ لیا۔

"پہلے کبھی دیکھی ہے اسے؟"

"نہیں۔"

زینب نے فوراً نظریں ہٹا لیں۔

بشیر نے خط کھولا۔

کاغذ زرد ہو چکا تھا۔

لکھائی کمزور مگر صاف تھی۔

"بشیر،

اگر یہ خط تم تک پہنچے تو شاید میں اس دنیا میں نہ ہوں۔ اور اگر میں ہوں بھی تو شاید اتنی دور ہوں کہ تم تک آنا ممکن نہ ہو۔

میں نے تم سے ایک بات ہمیشہ چھپائی۔

فہد ہمارا اکلوتا بیٹا نہیں تھا۔

اس کا ایک اور حصہ بھی تھا۔

ایک بیٹی۔

میں نے اسے جنم دیا تھا۔

مگر اسے تم سے چھپایا۔

مجھے معلوم ہے تم مجھے معاف نہیں کرو گے۔

لیکن کبھی کبھی عورت کے پاس گناہ اور مجبوری میں سے ایک کو چننے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

اس بچی کا نام زینب ہے۔

میں اسے اپنی بہن کے حوالے کر گئی تھی۔

وہ لوگ اسے لے گئے تھے۔

میں نے سوچا تھا حالات بہتر ہوں گے تو اسے واپس لاؤں گی۔

حالات کبھی بہتر نہیں ہوئے۔

بشیر، اگر وہ کبھی تمھارے دروازے پر آئے تو اسے دروازے سے واپس مت کرنا۔

وہ تمھاری بیٹی ہے۔

اور میری سب سے بڑی ادھوری دعا۔

سکینہ"

خط کے نیچے ایک تاریخ تھی۔

سترہ برس پرانی۔

بشیر دیر تک کاغذ کو دیکھتا رہا۔

کمرے میں خاموشی تھی۔

ایسی خاموشی جس میں گھڑی کی ٹک ٹک بھی کسی دور کے ماتم کی طرح محسوس ہوتی تھی۔

اس نے سر اٹھایا۔

زینب دروازے کے پاس کھڑی تھی۔

"تم... میری بیٹی ہو؟"

زینب نے سر جھکا لیا۔

"جی۔"

"تمھیں کس نے بتایا؟"

"خالہ نے مرنے سے پہلے۔"

"اور تم اتنے برس کہاں تھیں؟"

"اسی شہر میں۔"

بشیر نے جیسے یہ بات سنی ہی نہ ہو۔

"اسی شہر میں؟"

"جی۔"

"پھر کبھی میرے پاس کیوں نہیں آئیں؟"

زینب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے باپ نے مجھے قبول نہیں کیا۔"

بشیر کے ہاتھ سے خط چھوٹ گیا۔

"کیا؟"

"کہا گیا تھا کہ آپ بیٹی نہیں چاہتے تھے۔"

بشیر کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کے چہرے پر ایسی اذیت ابھری جیسے کسی نے پرانا زخم دوبارہ کھول دیا ہو۔

"سکینہ......"

اس نے پہلی بار چودہ برس بعد اپنی بیوی کا نام اس طرح لیا تھا۔

پھر اچانک وہ ہنس دیا۔

بہت ہلکی، بہت شکستہ ہنسی۔

"تو یہ تھا تمھارا راز؟"

زینب خاموش رہی۔

بشیر نے سر اٹھایا۔

"تمھیں معلوم ہے، میں نے سکینہ کو کبھی بیٹی کے لیے منع نہیں کیا تھا۔"

زینب نے چونک کر دیکھا۔

"پھر؟"

"جب تم پیدا ہوئی تھیں تو ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ماں اور بچی دونوں خطرے میں ہیں۔ میں باہر کھڑا تھا۔ مجھے اندر جانے نہیں دیا گیا۔ چند گھنٹے بعد سکینہ نے مجھے بتایا کہ بچی مر گئی ہے۔"

زینب کی سانس جیسے رک گئی۔

"آپ کو یقین تھا؟"

"ہاں۔"

بشیر نے آنکھیں بند کر لیں۔

"میں نے اس رات اپنی بیٹی کا نام بھی رکھ دیا تھا۔"

"کیا؟"

"زینب۔"

لڑکی کی آنکھوں میں خوف، حیرت اور ایک عجیب سی اپنائیت ایک ساتھ ابھری۔

"آپ نے مجھے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ پھر نام کیسے رکھا؟"

بشیر نے جواب دیا:

"سکینہ نے کہا تھا، اگر بیٹی ہوئی تو زینب رکھیں گے۔"

زینب نے پہلی بار اسے باپ کی طرح دیکھا۔

"تو آپ نے مجھے کبھی بھلایا نہیں تھا؟"

بشیر کے ہونٹ کانپے۔

"باپ بیٹی کو بھول سکتا ہے؟"

زینب نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بشیر اس کے قریب گیا۔

اس نے ہاتھ بڑھایا، مگر پھر روک لیا۔

شاید برسوں کی جدائی کے بعد باپ کو بھی بیٹی کو چھونے کا حق مانگنا پڑتا ہے۔

زینب نے خود اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

بشیر کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"بہت دیر کر دی تم نے۔"

زینب روتے ہوئے بولی:

"میں نے نہیں۔"

بشیر کے ہاتھ کا لمس ٹھہر گیا۔

"پھر؟"

"شاید ہم دونوں سے پہلے لوگوں نے دیر کی تھی۔"

بشیر نے اسے دیکھا۔

پھر پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ یہ لڑکی صرف اس کی بیٹی نہیں تھی؛ یہ اس کے گزرے ہوئے سترہ برسوں کی گواہ بھی تھی۔

"اب کہاں رہتی ہو؟"

"یہیں قریب۔"

"ماں؟"

"خالہ مر گئی ہیں۔"

"کوئی اپنا؟"

زینب نے اسے دیکھا۔

"اب شاید آپ ہیں۔"

بشیر نے نظریں چرا لیں۔

اس کی آنکھوں سے ایک آنسو نکل کر سفید داڑھی میں گم ہو گیا۔

اس رات پہلی بار اس گھر میں دو لوگوں نے کھانا کھایا۔

بشیر نے چولہے پر دال گرم کی۔

زینب نے روٹی پکائی۔

کھانا معمولی تھا۔

دال میں نمک کم تھا۔

روٹی کچھ جل گئی تھی۔

مگر بشیر نے برسوں بعد کھانا کھاتے ہوئے محسوس کیا کہ ذائقہ صرف نمک اور مرچ سے نہیں بنتا۔

کسی کے ساتھ بیٹھنے سے بھی بنتا ہے۔

کھانے کے بعد زینب برتن اٹھانے لگی تو بشیر نے روک دیا۔

"رہنے دو۔"

"کیوں؟"

"آج مجھے کرنے دو۔"

"آپ؟"

"ہاں۔"

وہ برتن دھونے لگا۔

زینب دروازے پر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ باپ شاید وہ نہیں ہوتا جو صرف اولاد کو نام دیتا ہے، بلکہ وہ ہوتا

ہے جو زندگی کے آخر میں بھی برتن دھونے پر اصرار کرے تاکہ بیٹی کے ہاتھ نہ بھیگیں۔

اگلے دن زینب پھر آئی۔

پھر تیسرے دن۔

پھر وہ روز آنے لگی۔

بشیر نے گھر کے ایک بند کمرے کی صفائی شروع کر دی۔

وہ کمرہ برسوں سے بند تھا۔

اس میں سکینہ کے کپڑے، پرانے برتن، فہد کے بچپن کے کھلونے اور کچھ خطوط پڑے تھے۔

ایک کونے میں سلائی مشین رکھی تھی۔

زینب نے اسے چھوا۔

"امی اس پر کپڑے سیتی تھیں؟"

بشیر نے چونک کر دیکھا۔

"تم نے اسے امی کہا؟"

زینب نے ہاتھ روک لیا۔

"اگر آپ کو برا لگا ہو..."

"نہیں۔"

بشیر نے آہستہ سے کہا:

"اچھا لگا۔"

زینب نے صندوق کھولا۔

اس میں ایک چھوٹا سا سرخ جوڑا رکھا تھا۔

بہت پرانا۔

زینب نے اسے ہاتھ میں لیا۔

"یہ کیا ہے؟"

بشیر نے دور سے دیکھا۔

اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"وہ..."

وہ رک گیا۔

"یہ تمھارے لیے تھا۔"

"میرے لیے؟"

"ہاں۔" "پھر اسے رکھا کیوں؟"

بشیر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

زینب نے جوڑا سینے سے لگا لیا۔

"آپ نے سوچا تھا میں زندہ ہوں؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

بشیر نے دھیرے سے کہا:

"پتہ نہیں۔ شاید باپ کا دل عقل سے زیادہ ضدی ہوتا ہے۔"

زینب نے جوڑا آنکھوں سے لگا لیا۔

اس روز دونوں نے سکینہ کے بارے میں بہت باتیں کیں۔

بشیر نے بتایا کہ سکینہ کو بارش بہت پسند تھی۔

"وہ بارش میں چھت پر چلی جاتی تھی۔"

"گیلی ہو جاتی ہوں گی۔"

"کہتی تھی، بارش میں بھیگنے سے آدمی کا پرانا غم ڈھل جاتا ہے۔"

زینب مسکرائی۔

"پھر آپ کیوں نہیں بھیگتے تھے؟"

بشیر نے ہنستے ہوئے کہا:

”میں؟ مجھے نزلہ ہو جاتا تھا۔“

دونوں ہنس پڑے۔

یہ ہنسی مختصر تھی۔

مگر بشیر کے لیے پندرہ برس کی سب سے لمبی ہنسی تھی۔

پھر ایک دن زینب نے پوچھا:

”ابو، آپ نے امی سے کبھی پوچھا نہیں کہ انھوں نے مجھے کیوں دیا؟“

بشیر خاموش ہو گیا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ مرنے سے پہلے میرے پاس بیٹھ کر روئی تھی۔“

”اور آپ نے کچھ نہیں پوچھا؟“

”کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب سننے سے آدمی معاف نہیں کرتا۔“

”اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب نہ ملنے سے آدمی عمر بھر خود کو سزا دیتا رہتا ہے۔“

بشیر نے اسے دیکھا۔

”یہ بات کس نے سکھائی؟“

زینب نے مسکرا کر کہا:

”زندگی نے۔“

اسی شام بشیر نے پہلی بار زینب کو بتایا کہ سکینہ کے آخری دن کیسے گزرے تھے۔

”وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ ایک رات اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا، بشیر، اگر میں تمھیں ایک راز بتاؤں تو کیا تم مجھے معاف کر دو گے؟“

”آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا، پہلے بتاؤ۔“

”پھر؟“

”وہ خاموش ہو گئی۔“

”کیوں؟“

”کہنے لگی نہیں، رہنے دو۔“

”اور آپ نے دوبارہ نہیں پوچھا؟“

”نہیں۔“

زینب دیر تک خاموش رہی۔

پھر بولی:

”شاید وہ ڈر گئی تھیں۔“

بشیر نے سر ہلایا۔

”شاید میں بھی ڈر گیا تھا۔“

زندگی میں بعض راز دو آدمیوں کے درمیان کھڑے رہتے ہیں، مگر دونوں ایک دوسرے سے پوچھنے کی ہمت نہیں کرتے۔

پھر وقت آتا ہے، ایک مر جاتا ہے اور راز دوسرے کے ساتھ دفن ہو جاتا ہے۔

یا کبھی، بہت دیر سے، کسی بیٹی کی شکل میں واپس آتا ہے۔

ایک صبح دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

بشیر نے دروازہ کھولا۔

سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔

اچھی پوشاک، ہاتھ میں موبائل، آنکھوں پر مہنگا چشمہ۔

”ابو؟“

بشیر کے چہرے پر جیسے اچانک برسوں پرانی روشنی لوٹ آئی۔

”فہد!“

اس نے بیٹے کو گلے لگا لیا۔

فہد نے رسمی انداز میں اسے تھاما۔

”کیسے ہیں؟“

”اب ٹھیک ہوں۔“

فہد اندر آیا۔

اس کی نگاہ زینب پر پڑی۔

وہ ٹھٹکا۔

”یہ کون ہے؟“

بشیر نے کہا:

”تمھاری بہن۔“

فہد نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔

”کیا؟“

”تمھاری بہن۔“

”ابو، آپ ٹھیک تو ہیں؟“

بشیر نے خط اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

فہد نے پڑھا۔

اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے گئے۔

کچھ دیر بعد اس نے زینب کو دیکھا۔

”آپ واقعی میری بہن ہیں؟“

زینب نے کہا:

”شاید۔“

فہد کے پاس اس لفظ کا کوئی جواب نہیں تھا۔

وہ صحن میں جا کر نیم کے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

بشیر اس کے پیچھے گیا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

فہد نے کہا:

”میں سوچ رہا ہوں کہ میری پوری زندگی میں مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میرے پاس ایک بہن ہے۔“

بشیر نے جواب دیا:

”مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے۔“

”آپ نے مجھے کبھی نہیں بتایا؟“

”مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔“

”اور امی؟“

بشیر نے درخت کی طرف دیکھا۔

”وہ جانتی تھیں۔“

فہد خاموش ہو گیا۔

”آپ ان سے ناراض تھے؟“

”وہ مر چکی تھیں۔“

”یہ جواب نہیں ہے۔“

بشیر نے گہری سانس لی۔

”بیٹا، مرد اکثر اپنی بیوی سے اس وقت ناراض ہوتے ہیں جب وہ اپنی ہی بے بسی سے ناراض ہوتے ہیں۔“

فہد نے پہلی بار باپ کو غور سے دیکھا۔

”آپ نے کبھی ان سے پوچھا کیوں نہیں؟“

”پوچھنے کے لیے زندگی چاہیے ہوتی ہے۔“

”اور آپ کے پاس؟“

”زندگی تو تھی۔ ہمت نہیں تھی۔“

وہ واپس اندر آ گئے۔

اس رات تینوں ایک ہی دسترخوان پر بیٹھے۔

بشیر کے لیے یہ منظر کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

اس نے دال کا نوالہ منہ میں رکھا اور مسکرایا۔

”سکینہ، دیکھ رہی ہو؟“

زینب نے پوچھا:

”کس سے بات کر رہے ہیں؟“

بشیر نے مسکرا کر کہا:

”تمھاری ماں سے۔“

فہد نے سر اٹھایا۔

”ابو...“

”ہاں؟“

”ایک بات کرنی ہے۔“

بشیر نے اس کی طرف دیکھا۔

فہد نے کچھ لمحے خاموش رہ کر کہا:

”میں چاہتا ہوں آپ میرے ساتھ دبئی چلیں۔“

بشیر کی آنکھوں میں خوشی اتر آئی۔

”واقعی؟“

”جی۔“

”کب؟“

”...“

”کتنے دن کے لیے؟“

فہد خاموش ہو گیا۔

”ہمیشہ کے لیے۔“

زینب نے پہلی بار سر اٹھایا۔

بشیر نے اس کی طرف دیکھا۔

”اور یہ؟“

فہد نے نظریں جھکا لیں۔

”یہ...... اپنی زندگی دیکھے گی۔“

”یعنی؟“

”ابو، آپ سمجھیں۔ میں وہاں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہوں۔ گھر چھوٹا ہے۔ ذمہ داریاں ہیں۔“

بشیر نے آہستہ سے کہا:

”میں نے کبھی تم سے گھر نہیں مانگا۔“

فہد نے چونک کر دیکھا۔

”پھر؟“

”صرف جگہ۔“

”کس چیز کی؟“

”تمھاری زندگی میں۔“

فہد خاموش ہو گیا۔

بشیر نے مزید کچھ نہ کہا۔

رات گہری ہوتی گئی۔

تینوں اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

بشیر دیر تک جاگتا رہا۔

اسے سکینہ یاد آتی رہی۔

اس نے سوچا، اگر سکینہ آج زندہ ہوتی تو کیا کہتی؟

شاید یہی کہتی:

”بشیر، دکھ بانٹ لو۔“
مگر دکھ بانٹنے سے کم نہیں ہوتے۔
صرف آدمی انھیں اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔
صبح فہد چلا گیا۔
اس نے جاتے ہوئے باپ کے ہاتھ میں ایک لفافہ رکھا۔
”اس میں کچھ پیسے ہیں۔“
بشیر نے لفافہ واپس کر دیا۔
”مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں۔“
”پھر کس چیز کی ضرورت ہے؟“
بشیر نے بیٹے کو دیکھا۔
”وقت۔“
فہد نے پہلی بار آنکھیں اٹھا کر باپ کو دیکھا۔
اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔
وہ چلا گیا۔
زینب دروازے میں کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی۔
بشیر نے کہا:
”جانے دو۔“
زینب نے پوچھا:
”آپ کو دکھ نہیں ہوا؟“
بشیر نے مسکرا کر کہا:
”دکھ؟“
پھر وہ نیم کے درخت کے نیچے جا بیٹھا۔

”بیٹی، میرے پاس دکھ ایک نہیں، ہزار ہیں۔“
زینب اس کے پاس بیٹھ گئی۔
”پھر آپ کرتے کیا ہیں؟“
بشیر نے آسمان کی طرف دیکھا۔
”انھیں گنتا نہیں۔“
”کیوں؟“
”کیونکہ گننے لگو تو خوشی کے لیے جگہ نہیں بچتی۔“
زینب نے اس دن پہلی بار محسوس کیا کہ اس کے باپ کا اصل دکھ فہد کا چلے جانا نہیں تھا۔
اس کا اصل دکھ یہ تھا کہ وہ محبت کرنے کے باوجود لوگوں کو روک نہیں سکتا تھا۔
شام کو زینب نے کہا:
”ابو، اگر میں آپ کو چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں تو؟“
بشیر نے ہنس کر کہا:
”چلی جانا۔“
”آپ روکیں گے نہیں؟“
”نہیں۔“
”کیوں؟“
”محبت اور قید میں فرق ہوتا ہے۔“
زینب خاموش ہو گئی۔
بشیر نے اس کی طرف دیکھا۔
”لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں بھی جاؤ، کبھی کسی کے دل کو گھر سمجھ کر اسے ویران

مت کرنا۔"

یہ جملہ زینب کے دل میں کہیں بہت گہرائی میں اتر گیا۔

چند ہفتے گزر گئے۔

بشیر کی صحت گرنے لگی۔

پہلے بخار۔

پھر کھانسی۔

پھر سانس کا مسئلہ۔

زینب اسے ہسپتال لے گئی۔

ڈاکٹر نے کہا:

"عمر زیادہ ہے۔ خیال رکھنا ہوگا۔"

بشیر نے ہنس کر پوچھا:

"ڈاکٹر صاحب، عمر زیادہ ہے یا دکھ؟"

ڈاکٹر مسکرا دیا۔

"دونوں۔"

"پھر علاج کس کا کریں گے؟"

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔

ہسپتال کی رات سفید تھی۔

دیواریں سفید۔

چادریں سفید۔

روشنی سفید۔

صرف بشیر کی آنکھوں میں ماضی کے رنگ تھے۔

زینب کرسی پر بیٹھی تھی۔

بشیر نے آنکھیں کھولیں۔

"زینب۔"

"جی۔"

"ایک کام کرو گی؟"

"جی۔"

"گھر جاؤ۔ صندوق میں میری پرانی ڈائری ہے۔ لے آؤ۔"

زینب گھر گئی۔

صندوق کھولا۔

کپڑوں کے نیچے ڈائری رکھی تھی۔

اس کے اوپر سکینہ کا سرخ جوڑا تھا۔

زینب نے پہلے جوڑے کو دیکھا۔

پھر ڈائری اٹھائی۔

اسے اچانک محسوس ہوا کہ وہ صرف کاغذ نہیں لے جا رہی، اپنے باپ کی پوری زندگی اٹھا رہی ہے۔

وہ ہسپتال واپس آئی۔

بشیر نے ڈائری دیکھی تو مسکرایا۔

"پڑھو گی؟"

"آپ سنائیں گے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کچھ باتیں آدمی اپنے مرنے کے قریب آ کر بھی خود نہیں پڑھ سکتا۔"

زینب نے ڈائری کھولی۔

پہلا صفحہ:

"آج میری بیٹی پیدا ہوئی۔ میں نے اسے دیکھا نہیں، مگر اس کا نام زینب رکھا ہے۔"

زینب کے ہاتھ کانپ گئے۔

دوسرا:

"آج ڈاکٹر نے کہا بچی نہیں بچی۔ سکینہ روئی۔ میں نے اسے کہا اللہ کی مرضی۔ مگر میرے اندر کچھ مر گیا۔"

تیسرا:

"آج زینب ایک سال کی ہوئی۔ میں نے اس کے لیے ایک سرخ جوڑا خریدا۔"

چوتھا:

"آج زینب پانچ سال کی ہوئی۔"

پانچواں:

"آج زینب دس سال کی ہوئی۔"

ہر سال ایک جملہ تھا۔

ہر سال ایک یاد۔

ہر سال ایک خاموش ماتم۔

زینب پڑھتی رہی۔

پھر ایک صفحے پر لکھا تھا:

"آج فہد نے کہا کہ وہ بڑا ہو کر مجھے دبئی لے جائے گا۔"

زینب مسکرائی۔

پھر اگلا صفحہ:

"آج فہد پہلی بار مجھ سے ناراض ہوا۔ شاید بیٹے کا بڑا ہونا باپ کے چھوٹا ہونے کا آغاز ہے۔"

زینب کی آنکھیں بھر آئیں۔

پھر ایک اور صفحہ:

"آج فہد چلا گیا۔ میں نے اسے جاتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکا۔ شاید ہوائی اڈے کی جلدی تھی۔ شاید میری آنکھوں سے ڈر گیا تھا۔"

اس کے بعد کئی صفحات خالی تھے۔

پھر اچانک ایک جملہ:

"آج مجھے معلوم ہوا کہ انتظار بھی ایک بیماری ہے۔ اس کا علاج ملاقات نہیں، عادت ہے۔"

زینب نے ڈائری بند کر دی۔

"ابو..."

بشیر نے آنکھیں بند رکھیں۔

"ہاں؟"

"آپ نے اتنے سال یہ سب لکھا؟"

"کچھ دکھ بولے نہیں جاتے۔"

"تو پھر؟"

"کاغذ سن لیتا ہے۔"

زینب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ نے مجھے اتنا یاد کیا؟"

"تمھیں نہیں۔"

زینب چونکی۔

بشیر نے مسکرا کر کہا:

"میں اس باپ کو یاد کرتا رہا جو تمھارا باپ بننا چاہتا تھا۔"

زینب رو پڑی۔

"اور اب؟"

"اب وہ باپ تھک گیا ہے۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں آ گئی ہوں۔"

بشیر نے آنکھیں کھولیں۔

اس نے زینب کو دیر تک دیکھا۔

"ہاں۔"

اس نے بہت آہستہ کہا:

"اب میں تھوڑا آرام کر سکتا ہوں۔"

اسی رات بشیر کی حالت اچانک خراب ہو گئی۔

ڈاکٹر آئے۔

مشینوں کی آوازیں بڑھ گئیں۔

زینب باہر کھڑی دعا کرتی رہی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر باہر آیا۔

اس کے چہرے پر وہ خاموشی تھی جسے سننے کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

زینب نے پوچھا:

"ابو؟"

ڈاکٹر نے سر جھکا لیا۔

زینب نے آنکھیں بند کر لیں۔

مگر چیخی نہیں۔

وہ صرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

کچھ لوگ روتے ہوئے اپنے پیارے کو کھوتے ہیں۔

کچھ لوگ خاموش رہ کر۔

خاموشی کا غم زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

شام تک جنازہ گھر پہنچا۔

وہی پرانا مکان۔

وہی نیم کا درخت۔

وہی شکستہ دروازہ۔

بس بشیر نہیں تھا۔

نماز جنازہ کے بعد لوگ چلے گئے۔

رات کو زینب اکیلی صحن میں بیٹھی تھی۔

نیم کے درخت سے ایک سوکھا پتہ ٹوٹ کر اس کی گود میں آ گرا۔

اس نے اسے اٹھایا۔

تب اسے خیال آیا کہ ابو نے آخری بات کیا کہی تھی۔

"دکھ گنتا نہیں۔"

وہ اندر گئی۔

صندوق کھولا۔

ڈائری دوبارہ نکالی۔

آخری صفحے کے پیچھے ایک اور کاغذ تھا۔

زینب نے کھولا۔

اس پر صرف ایک جملہ لکھا تھا:

"زینب، اگر کبھی تمھیں لگے کہ تم اکیلی ہو تو یاد رکھنا، میں نے تمھیں پیدا ہونے سے پہلے چاہا تھا، اور مرنے کے بعد بھی چاہتا رہوں گا۔"

زینب دیر تک کاغذ کو دیکھتی رہی۔

پھر اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔

اچانک باہر دروازے پر دستک ہوئی۔

وہ چونکی۔
دروازہ کھولا۔
سامنے فہد کھڑا تھا۔
آنکھیں سرخ۔
چہرہ بجھا ہوا۔
وہ کچھ نہ بولا۔
زینب نے بھی نہیں۔
کچھ لمحوں بعد فہد نے آہستہ سے کہا:
"میں دیر سے آیا ہوں۔"
زینب نے جواب دیا:
"ابو بھی یہی کہتے تھے۔"
فہد کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔
"کیا انھوں نے میرے لیے کچھ کہا؟"
زینب نے ڈائری اس کے ہاتھ میں دے دی۔
فہد نے اسے کھولا۔
کچھ دیر پڑھتا رہا۔
پھر اچانک زمین پر بیٹھ گیا۔
"میں نے انھیں وقت نہیں دیا..."
زینب نے کہا:
"وہ تمھیں وقت دیتے رہے۔"
فہد نے سر اٹھایا۔
"کیا؟"
"ڈائری کے ہر صفحے پر تم بھی ہو۔"
فہد نے جلدی سے صفحات پلٹنے شروع کیے۔
واقعی۔

ہر سال زینب کے ساتھ ایک جملہ فہد کے لیے بھی تھا۔
"آج میرا بیٹا سکول گیا۔"
"آج فہد نے پہلی بار چلنا سیکھا۔"
"آج فہد نے کہا کہ وہ بڑا ہو کر مجھے دبئی لے جائے گا۔"
"آج فہد پہلی بار مجھ سے ناراض ہوا۔"
"آج فہد چلا گیا۔"
اور آخری سے ایک صفحہ پہلے:
"آج میرا بیٹا واپس آیا تھا۔ میں اسے روک نہ سکا۔ شاید باپ کبھی کبھی بیٹے سے بھی شرما جاتا ہے کہ کہیں اس کی محبت بوجھ نہ بن جائے۔"
فہد نے ڈائری بند کر دی۔
وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔
"میں برا بیٹا تھا۔"
زینب نے آہستہ سے کہا:
"نہیں۔"
"میں نے انھیں اکیلا چھوڑ دیا۔"
"ہاں۔"
فہد نے آنسوؤں میں اسے دیکھا۔
زینب نے کہا:
"مگر اکیلا چھوڑ دینا اور ہمیشہ کے لیے کھو دینا ایک بات نہیں۔"
فہد نے سر جھکا لیا۔
"اب بہت دیر ہو گئی ہے۔"

زینب نے نیم کے درخت کی طرف دیکھا۔
"دیر ہو گئی ہے ۔ مگر شاید پوری نہیں
ہوئی۔"
"کیا مطلب؟"
"ابو کہا کرتے تھے، آدمی مرنے کے بعد بھی
کچھ لوگوں میں زندہ رہتا ہے۔"
فہد نے ڈائری سینے سے لگا لی۔
"میں کیا کروں؟"
"وہی جو وہ تم سے چاہتے تھے۔"
"کیا؟"
"وقت دو۔"
"کسے؟"
زینب نے دروازے سے باہر دیکھا۔
وہی گلی۔
وہی لوگ۔
وہی فقیر۔
وہی شہر۔
"جنھیں تم سمجھتے ہو کہ تمھارے پاس ہمیشہ
رہیں گے۔"
صبح ہوئی۔
گلی میں پھر وہی فقیر بیٹھا تھا۔
وہی میلی چادر۔
وہی کمزور آواز۔
"اللہ کے نام پر کچھ دے دے..."
زینب باہر نکلی۔
اس نے فقیر کے ہاتھ میں روٹی رکھی۔

فقیر نے اسے دیکھا۔
"بیٹی، اللہ تمھیں خوش رکھے۔"
زینب نے ایک لمحے کو سوچا۔
خوشی؟
کیا واقعی خوشی نام کی کوئی چیز ہوتی ہے؟
پھر اسے ابو کی آواز یاد آئی:
"دکھ گننا نہیں۔"
وہ مسکرائی۔
بہت ہلکی سی۔
اسی وقت فہد اس کے برابر آ کر کھڑا ہو گیا۔
زینب نے اسے دیکھا۔
"کیا ہوا؟"
فہد نے کہا:
"آج سے میں یہاں رہوں گا۔"
"کتنے دن؟"
"پتہ نہیں۔"
"وجہ؟"
"بعد میں۔"
وہ نیم کے درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔
دونوں خاموش تھے۔
کچھ دیر بعد فہد نے کہا:
"تمھیں کبھی ابو پر غصہ آیا؟"
زینب نے سوچا۔
"ہاں۔"
"کیوں؟"
"کہ انھوں نے مجھے پہلے کیوں نہیں ڈھونڈا۔"

"اور اب؟"

"اب سمجھتی ہوں، بعض لوگ دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے ہی خود کو قصوروار سمجھ لیتے ہیں۔"

فہد نے سر اٹھایا۔

"اور امی؟"

زینب نے آسمان کی طرف دیکھا۔

"شاید انھوں نے غلطی کی۔"

"معاف کر دیا؟"

"کوشش کر رہی ہوں۔"

"میں بھی۔"

کچھ دیر بعد زینب اٹھ کر گھر کے اندر گئی۔

اس نے دیوار سے سکینہ کی تصویر اتاری۔

اسے صاف کیا۔

پھر بشیر کی تصویر کے ساتھ رکھ دیا۔

دونوں تصویروں کے درمیان ایک چھوٹی سی جگہ خالی تھی۔

اس نے فہد سے کہا:

"یہاں کیا ہونا چاہیے؟"

فہد نے جواب دیا:

"تمھاری تصویر۔"

زینب مسکرائی۔

"نہیں۔"

"پھر؟"

"یہ جگہ خالی رہنے دو۔"

"کیوں؟"

"تاکہ یاد رہے کہ ہر گھر میں کچھ نہ کچھ خالی رہ جاتا ہے۔"

فہد نے سر ہلایا۔

"اور شاید اسی خالی جگہ سے روشنی بھی آتی ہے۔"

زینب نے اسے دیکھا۔

"یہ تم نے خود سوچا؟"

فہد پہلی بار مسکرایا۔

"شاید ابو نے کہیں لکھا ہو۔"

دونوں ہنس پڑے۔

نیم کے درخت پر اچانک ایک نیا سبز پتا نمودار ہوا۔

زینب نے اسے دیکھا۔

پھر آسمان کی طرف دیکھا۔

اسے یوں لگا جیسے بہت دور، کسی ایسی جگہ جہاں نہ فاصلہ ہے نہ وقت، ایک بوڑھا آدمی نیم کے درخت کے نیچے بیٹھا مسکرا رہا ہے۔

اس کے ہاتھ میں ٹھنڈی چائے کا پیالہ ہے۔

اور وہ ہمیشہ کی طرح کسی سے کہہ رہا ہے:

"دیکھو سکینہ، آج گھر میں پھر آوازیں ہیں۔"

ہوا چلی۔

نیم کے پتے سرسرائے۔

زینب نے آنکھیں بند کر لیں۔

اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا ہو۔

وہ ہاتھ جو زندگی میں صرف چند برس اس

کے سر تک پہنچ سکا تھا، مگر جس کی حرارت اس کے اندر ہمیشہ کے لیے رہ گئی تھی۔

اس نے دل ہی دل میں کہا:

''ابو، آپ ٹھیک کہتے تھے۔

دکھ ہزار ہوں تو ہوں...

انھیں گننے بیٹھ جاؤ تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

اور اگر محبت کا ایک چراغ جلائے رکھو تو ہزار دکھ بھی اس کی روشنی کو شکست نہیں دے سکتے۔''

گلی میں سورج اتر آیا تھا۔

لوگ اپنے کاموں کو جا رہے تھے۔

دکانیں کھل رہی تھیں۔

بچے سکول کے لیے بھاگ رہے تھے۔

فقیر نے اپنی چادر سمیٹی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

زندگی کسی کے مرنے سے رکتی نہیں۔

یہ اس کی سب سے بڑی بے رحمی بھی ہے اور سب سے بڑی مہربانی بھی۔

زینب نے گھر کا دروازہ کھولا۔

اندر بشیر کی چارپائی ابھی تک ویسی ہی تھی۔

تکیے کے پاس اس کی عینک رکھی تھی۔

میز پر وہی پیالی تھی جس میں آخری بار اس نے چائے پی تھی۔

زینب نے پیالی اٹھائی۔

اسے دھویا نہیں۔

بس الماری میں رکھ دیا۔

کچھ چیزیں صاف کرنے کے لیے نہیں ہوتیں۔

انھیں محفوظ رکھا جاتا ہے۔

فہد نے پوچھا:

''کیا کر رہی ہو؟''

زینب نے کہا:

''گھر سنبھال رہی ہوں۔''

''اور ہم؟''

وہ مسکرائی۔

''ہم بھی۔''

نیم کے درخت سے ایک اور سبز پتا گرا۔

اس بار زینب نے اسے زمین پر نہیں گرنے دیا۔

اس نے اسے اٹھایا اور بشیر کی ڈائری کے اندر رکھ دیا۔

پھر ڈائری بند کی۔

اور پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ شاید اس کے باپ کی زندگی کا آخری جملہ ادھورا نہیں تھا۔

کیونکہ کچھ کہانیاں اختتام پر ختم نہیں ہوتیں۔

وہ اگلی نسل کے دل میں جا کر شروع ہوتی ہیں۔

اور کچھ دکھ...

دکھ ہزار ہوں...

اگر کوئی انھیں محبت سے چھو لے تو وہ دکھ نہیں رہتے۔

وہ یاد بن جاتے ہیں۔

اور یاد......

موت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

# غزل

اِسی غم کی اوٹ ملا تھا وہ، مجھے پہلی بار یہیں کہیں
کسی چشمِ تر میں تلاش کر اُسے میرے یار یہیں کہیں

سرِ خیلِ اہلِ ہدیٰ نہ ہو، یہ فقیر مردِ خدا نہ ہو
سَر اُٹھا کے دیکھ، دھرا نہ ہو، سَرِ انکسار یہیں کہیں

یہ جو سمتِ عشق میں جھیل ہے، یہ جو سمتِ غم میں پہاڑ ہیں
مری راہ دیکھ رہا نہ ہو مرا شہ سوار یہیں کہیں

قرینِ ہَوا پہ سوار ہوں کہ غبارِ ناقۂ یار ہوں
مجھے راستے میں نہ چھوڑ دے مرا راہوار یہیں کہیں

یہ تہِ فصیلِ سراب سا، کبھی سیلِ تیغ و طناب تھا
مری جاں! خیام پہ یہ تھے، ترے جاں نثار یہیں کہیں

طلبِ طلب میں چلا تھا میں، عجب اوجِ غم سے گرا تھا میں
دل و جاں شکستہ پڑا تھا میں، تہِ آب شار یہیں کہیں

مرے دل کے باب نہ کھولنا، مرے جان و تن نہ ٹٹولنا
کسی زاویے میں پڑا نہ ہو، وہ بُتِ نگار یہیں کہیں

مرے ہم مزاجِ غم آشنا، دمِ احتیاج رَم آشنا
اِسی کارزار میں کھپ رہے، مرے ہم دیار یہیں کہیں

گُلِ شام! اے گُلِ مُرگئیں! وہ خدنگِ ربطِ گُل آفریں
مری جان! دیکھ ہُوا نہ ہو، مرے آر پار یہیں کہیں

مرے سامنے، ترے رُوبرو، مرا حال تجھ کو سُنا نہ دیں
مری کھوج میں تجھے آ نہ لیں، مرے غم گُسار یہیں کہیں

کسی سبز پیڑ کے سائے میں، کسی کاروان سرائے میں
مری جان! رمز سرا نہ ہوں ترے رازدار یہیں کہیں

ترے سَیلِ لَمس میں بہ گئے، تنِ پا بہ گِل کھڑے رہ گئے
مرے آس پاس تلاش کر، مرے برگ و بار یہیں کہیں

پرِ کاہ سبز کچور سا، قدِ سربلند کھجور سا
مرے جی میں تھا کہ سمیٹ لوں خط و خالِ یار یہیں کہیں

مری جاں! یہی وہ مقام ہے، یہی مہبطِ گُلِ شام ہے
مجھے یاد ہے کہ کھلا تھا وہ گُلِ نَو بہار یہیں کہیں

یہ جو پنکھڑی ہے گلاب سی، یہ جو انکھڑی ہے شراب سی
اُنھیں چشم و لب میں تلاش کر، مجھے میرے یار یہیں کہیں

ترا ہاتھ دیکھتے دیکھتے، مرے ہاتھ پر بھی نہ کھینچ دے
خطِ قلب و ذہن کے درمیاں، وہ خطِ غبار یہیں کہیں

فقط ایک گام کی راہ پر، فقط ایک نام کی آہ پر
مری راہ دیکھ رہا نہ ہو، مرا انتشار یہیں کہیں

ترے سامنے، ترے دیکھتے مری اُنگلیوں سے پھسل گئے
مرے ولولے، مرے حوصلے مرا اختیار یہیں کہیں

اُسے کوچ کرنا تھا، کر گیا، مرے جسم و جاں سے گزر گیا
وہ غزالِ زاویۂ ختن، وہ گلِ غبار یہیں کہیں

ترے راستے میں ہوا ہوئیں، مری خواہشیں مری کاہشیں
ہوسِ حواس بھی کھو نہ دے، ترا بُردبار یہیں کہیں

یہ جو محوِ کارِ تلاش ہیں، یہ ترے جنونِ معاش ہیں
مجھے ڈر ہے، اب نہ سمیٹ لیں وہ یہ کاروبار یہیں کہیں

وہ کڑک کہ تن میں دھمک اُٹھی، وہ تڑک کہ دل میں چمک اُٹھی
کوئی درد تھا، کوئی ٹیس تھی، دلِ بُردبار یہیں کہیں

یہ جو خاکِ ہجر نژاد ہے، یہ عروجِ اہلِ مراد ہے
اِسی جا، جنم ابھی لے نہ لیں کئی مرغ زار یہیں کہیں

گُلِ شام! اے گُلِ سُرمگیں! ترا ہم جمال دلِ حزیں
مری آگ دیکھتے جل بجھا، وہ ستارہ وار یہیں کہیں

اِسی تنگ و تار اُطاق میں، اِسی کُنج کے کسی طاق میں
غمِ یار رکھ کے گیا تھا میں، غمِ روزگار یہیں کہیں

**خالد احمد**

# غزل

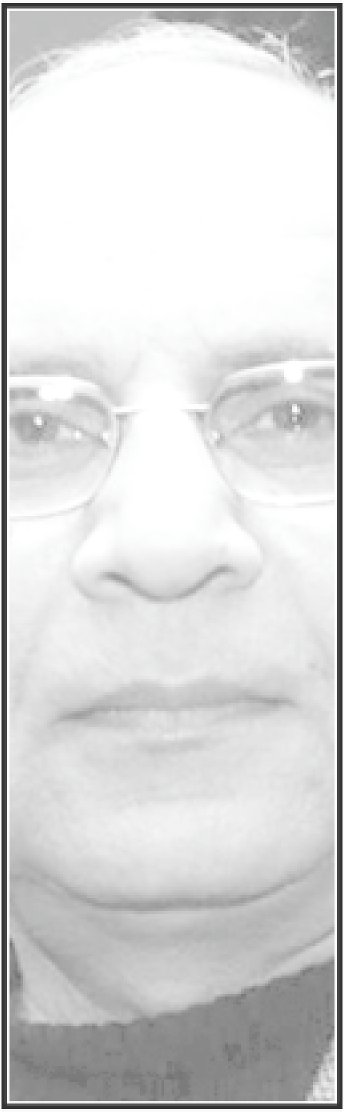

لمس شناسی وصف ہے کومل پوروں کا
اس فن کورا پتھر ہاتھ کٹھوروں کا

اہلِ حکومت اپنا لہجہ ٹھیک کریں
ہم انساں ہیں غول نہیں ہیں ڈھوروں کا

اور سیاست کیا ہے پوری دنیا کی
سارا آپس کا جھگڑا ہے چوروں کا

خوف سے خلقت قید ہے بند مکانوں میں
شہر پہ جیسے راج ہے آدم خوروں کا

مجرم کون اپنا مجرم کا مجرم کون
کس کو سرا ملا اِن الجھی ڈوروں کا

دنیا سے درکا نہیں کچھ اور ہمیں
من پیاسا ہے صرف خلوص کٹوروں کا

مست ہوا کے جھونکوں کا حظ اپنی جگہ
لطف جدا ہے اندر کے ہلکوروں کا

عالی جیون کھیل کی اپنی موسیقی
ہر سو ایک ہجوم انا کے شوروں کا

**جلیل عالی**

# غزل

صبح دم پھول پہ شبنم کو اترتے دیکھا
پرتوِ خور سے مگر پل میں بکھرتے دیکھا

برق نے شعلے گرائے ہیں مگر پھر بھی پھول
اپنے اندر کی حرارت سے نکھرتے دیکھا

اس نے تو چاہنے والوں کی پذیرائی کی
اس کو تو ہم نے ہمہ وقت سنورتے دیکھا

آخر وقت بھی کوشش کا ثمر دیکھا ہے
ڈوبتے شخص کو بھی ہم نے ابھرتے دیکھا

آزمائش کی گھڑی اس پہ بہت بھاری تھی
سجدۂ سہو بھی کم ظرف کو کرتے دیکھا

ایک مدت سے مری آنکھ میں اس کے جلوے
ایک مدت سے اسے دل میں گزرتے دیکھا

ہے تعارف کی ریاض اپنی ہزاروں شکلیں
اس کے دم خم سے پہاڑوں کو بکھرتے دیکھا

سید ریاض حسین زیدی

# غزل

کوئی نہیں جو مارِ آستیں ہوا
مرا وجود میرا نکتہ چیں ہوا

یہ انکشافِ ذات بھی عجیب ہے
کہیں کہیں ہوا کہیں نہیں ہوا

تری دلیل کارگر نہیں ہوئی
میں چپ ہوا ہوں مطمئن نہیں ہوا

ذرا سی روشنی سے کام لیجیے
چراغ ہی جلا ہے دن نہیں ہوا

مجھے وہ جان کر بھی جانتا نہیں
جو ہم قدم نہیں تھا ہم نشیں ہوا

قبول کر رہا ہوں اپنا فیصلہ
مگر جو ہونا چاہیے نہیں ہوا

مرے ہی پر جلا دیے غرور نے
عجب مرا مزاج آتشیں ہوا

ہزار احتیاط پر بھی حادثہ
جہاں پہ لکھ دیا گیا وہیں ہوا

کوئی تو ہے حصار میں لیے کنور
یقیں نہیں کیا تھا اب یقیں ہوا

اعجاز کنور راجہ

# غزلیں

شاخِ ہستی پہ بصیرت کا ثمر آنے میں
عمر لگتی ہے اِس اُمید کے بر آنے میں

سانس کی گٹھڑی کو اِک اور گرہ دے رکھیں
ابھی کچھ دیر ہے انجام سفر آنے میں

کٹ گیا دید و نظارہ کا زمانہ آخر
ہم سے سستی ہُوئی دُنیا کو نظر آنے میں

بجھ گیا ہوتا ہے دہلیز پہ استادہ چراغ
صبح ہو جاتی ہے خاورؔ ہمیں گھر آنے میں

خاک تک وقت کی مٹھی میں سلامت نہ رہی
اِتنی تاخیر ہُوئی اپنی خبر آنے میں

## خاور اعجاز

مِلتا نہیں جو دیر سے اُس کا پتا کہیں
مجھ میں ہی چھپ کے بیٹھا نہ ہو بے وفا کہیں

اُڑتے رہیں گے صورتِ گردِ انا مگر
بیٹھیں گے کیوں بھلا ترے در کے سوا کہیں

اترائیں کیا کہ جب خس و خاشاک ہو گئے
لے جائے اَب اُڑا کے یہ بادِ فنا کہیں

ہم بھی ہیں مثلِ حضرتِ جرأت سو ہم نے بھی
پھینکا تھا اپنا تیر کہیں اور لگا کہیں

لوٹے ہیں لامکاں میں تو اَب مِل نہیں رہا
اپنا بھی اِک مکان یہیں پر تو تھا کہیں

# غزل

سیر گاہوں میں سرِ شام ہَوا چلتے ہی
کتنے گُل چہرہ، گلابوں سے نکل آتے ہیں

آؤ کچھ دیر کہیں بیٹھ کے گپ شپ کرلیں!
آؤ کچھ دیر حجابوں سے نکل آتے ہیں

اِک طلسماتی کہانی کے وہ کردار ہیں ہم
بَن کے تعبیر، جو خوابوں سے نکل آتے ہیں

حرفِ آخر کی طرف جب بھی کبھی پڑھتا ہوں
کچھ سوالات، جوابوں سے نکل آتے ہیں

چائے خانے ہوں کہ ڈھابے، یہی مے خانے ہیں
غم غلط کرتے ہیں، ڈھابوں سے نکل آتے ہیں

پھر سے لوٹا دیے جاتے ہیں اُسی صحرا میں
جب بھی ہم لوگ، سرابوں سے نکل آتے ہیں

پھر اُچک لیں گے ہمیں، بیچ میں سرمایہ دار
گر وڈیروں سے، نوابوں سے نکل آتے ہیں

نُقرئی پاؤں جُرابوں سے نکل آتے ہیں
چاند سے چہرے نقابوں سے نکل آتے ہیں

مری بُک شیلف میں ہیں گوشہ نشیں، جانِ انیس!
رول ماڈل، جو کتابوں سے نکل آتے ہیں

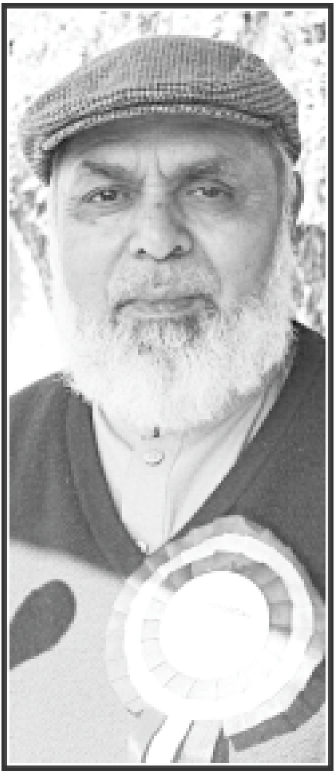

**محمد انیس انصاری**

# غزل

احوال اپنے دل کا بتایا نہیں کبھی
سپنا کسی کو پورا سنایا نہیں کبھی

بس اک جنم کا سیر کدہ ہے یہ زندگی
کوئی بھی پھر سے لوٹ کر آیا نہیں کبھی

ویسے تو عمر بھر ہی نہیں پوری نیند کی
اک خواب ایسا بھی ہے گنوایا نہیں کبھی

جی بھر کے دیکھ لینا میسر نہیں ہوا
تصویر کو پرے یوں ہٹایا نہیں کبھی

جیسی ملی تھی زندگی ویسے گزار دی
کیا ہیں کیوں ہیں شور مچایا نہیں کبھی

لکھی ہے سرگزشت بڑے اہتمام سے
عظمیؔ کوئی اک حرف مٹایا نہیں کبھی

اسلام عظمی

# غزل

راحت سرحدی

تھا کسی وقت ذہن پر جو سوار
میں نے دل سے اسے دیا ہے اتار

دینا چاہا اسے سہارا تو
میرے اوپر ہی آ گری دیوار

عقل ہوتی تو عشق کیوں کرتا
ایک کچے گھڑے پہ دریا پار

جیسے یہ کائنات بہری ہو
کوئی سنتا نہیں ہے چیخ پکار

اتنی عجلت میں فیصلہ نہ کریں
دیکھیے تیل اور تیل کی دھار

شاعری سے بھرا پڑا ہے گھر
جیب میں کچھ نہیں مگر سرکار

شرم آنے لگی ہے اب راحت
مانگتے وقت دوستوں سے ادھار

# غزل

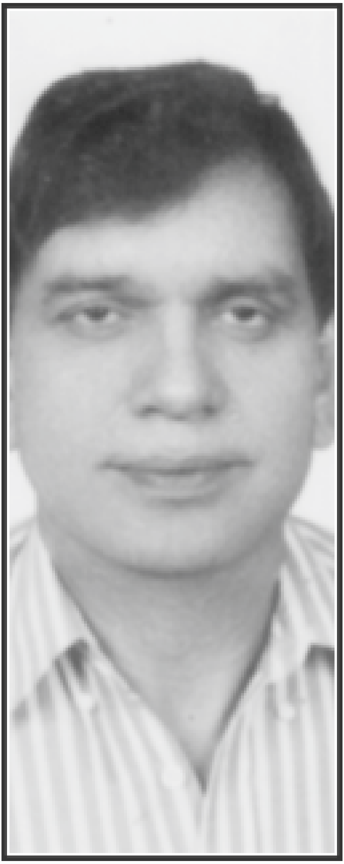

قیوم طاہر

اِسی فریب میں پلا ، بڑا ہوا
یہ پُتلیوں کا کھیل دیکھتا ہوا

ہزارہا برس کی منہ پہ بے بسی
دراوڑوں کا نقش ہے کُھدا ہے

کہاں گنوا کے آ گیا ریاضتیں
یہ میں ، کہاں پہ جا کے جتلا ہوا

خبر ہوئی تو پاؤں خاک سے جدا
ستاروں کی میں چال دیکھتا ہوا

میں پھر کہاں ، کہاں مرا وجود تھا
وہ جس گھڑی کہ تجھ سے سامنا ہوا

سِکھا رہا تھا حرف و لفظ ، اور بیاں
ستارہ کوئی مجھ میں بولتا ہوا

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بند دروازہ تھا خالد ، یا عبادت گاہ تھی
اس کے در پر سارے بے کس ، سارے بے گھر سو گئے

# غزل

کوئی کوہِ مراد ہے تو بتا
اس جگہ کوئی شاد ہے تو بتا

ہم بھی تختِ سبا اٹھا لائیں
اسم وہ کیا تھا یاد ہے تو بتا

میرے دل میں تو بس محبت ہے
تیرے دل میں عناد ہے تو بتا

اس قدر کیوں فساد برپا ہے
کوئی وجہِ فساد ہے تو بتا

اس نگر میں تو خوف آتا ہے
کوئی پر امن واد ہے تو بتا

چاند پر بھی مری زمیں کی طرح
آب ہے برق و باد ہے تو بتا

دوستی میں سراہتے ہیں تجھے
شاعری پہ بھی داد ہے تو بتا

باقی احمد پوری ہے غالب ہے
اور کوئی نام یاد ہے تو بتا

باقی احمد پوری

# غزل

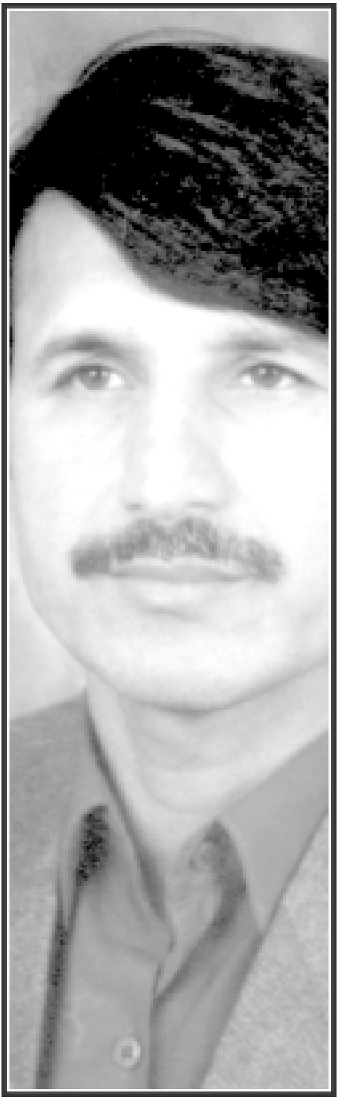

مشکل کو ٹالنے کا ہنر ہم پہ چھوڑ دو
تم تھک چکے ہو اب یہ سفر ہم پہ چھوڑ دو

اتنا کرو کے سیپ فراہم کرو ہمیں
قطرے بنیں گے کیسے گہر ہم پہ چھوڑ دو

اس کے لیے جو تم نے کیا سب کو علم ہے
اس کے مکین ہم بھی ہیں گھر ہم پہ چھوڑ دو

خستہ مکاں سے پیار تمہیں ہو تو ہم کہیں
دیوار تم سہار لو در ہم پہ چھوڑ دو

ہم نے کبھی فریب چمن کو دیا نہیں
نشو نمائے برگ و ثمر ہم پہ چھوڑ دو

تم کو تو صرف اس کی بہاروں سے کام تھا
نمٹیں گے ہم خزاں سے شجر ہم پہ چھوڑ دو

کردار جن کا غارتِ تعبیر ہی رہا
کہتے ہیں وہ بھی، خواب نگر ہم پہ چھوڑ دو

گلزار ہم چراغ نہیں آفتاب ہیں
ہنگامہ طلوعِ سحر ہم پہ چھوڑ دو

گلزار بخاری

# غزل

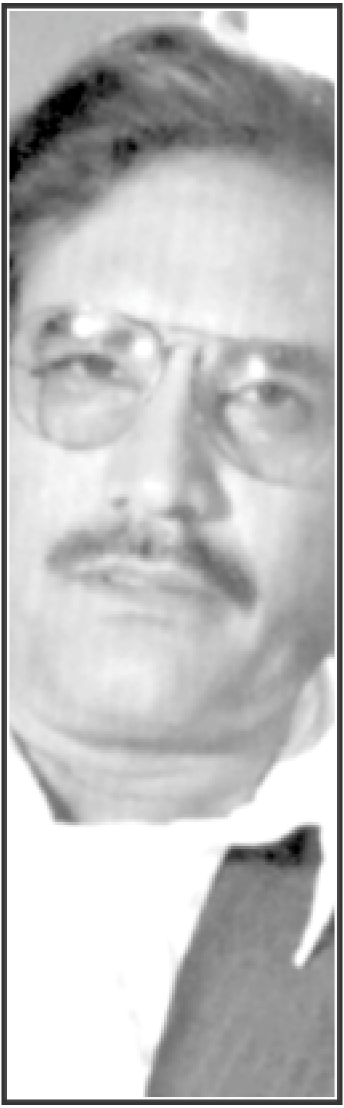

بات سنتا جا مری روٹھ کے جانے والے
مر گئے لوگ زمانے میں منانے والے

بزمِ عالم کے سدا صدر نشیں رہتے ہیں
اپنی ہستی کو بہ صد شوق مٹانے والے

دوستی تیری تصنع ہی کی پروردہ ہے
گرم جوشی سے سدا ہاتھ ملانے والے

میں ہوں گم نام سا، درویش صفت سا شاعر
میری تقلید کریں پھر بھی زمانے والے

اب نگاہوں کو نہیں جچتا کوئی چہرۂ گل
اب کہاں لوگ بھلا، دل میں سمانے والے

فرشِ خاکی کے مسائل سے نمٹ لے پہلے
چاند پر جا کے نئے شہر بسانے والے

مٹ نہیں سکتی مقدر کی سیاہی، شوکت
کتنے ناداں ہیں چراغوں کو جلانے والے

شوکت محمود شوکت

# غزل

لپٹی رہیں گی یونہی ضیائیں چراغ سے
لڑتی رہیں ہزار ہوائیں چراغ سے

جی بھر کے دیکھتے ہیں مجھے اس کے خد و خال
کچھ دیر لو کو دور ہٹائیں چراغ سے

جلتے ہوئے چراغ کو اس سے غرض نہیں
جتنے دیے بھی چاہیں جلائیں چراغ سے

کتنا بھی روشنی سے تعلق ہو آپ کا
رکھیے گا دور اپنی قبائیں چراغ سے

کچھ دن خوشی سے کیجیے چھالوں کی دیکھ بھال
کس نے کہا تھا ہاتھ ملائیں چراغ سے

اک سلسلہ ہے یاد کی لو سے بندھا ہوا
ممکن نہیں کہ ہاتھ چھڑائیں چراغ سے

اکثر ہوا کے سامنے ہم ہی ڈٹے رہے
اکثر ہمی نے لی ہیں دعائیں چراغ سے

بام و در و دیوار پہ روشن تو کیجیے
لیکن کبھی بھی ''لو نہ لگائیں'' چراغ سے

ایسا نہ ہو کہ اس کو اکیلے میں ڈر لگے
فی الحال آپ دور نہ جائیں چراغ سے

آتے ہیں بار بار پتنگوں کے قافلے
کتنا بھی ان کو دور بھگائیں چراغ سے

شاہد اسی کے دم سے اجالے ہیں دستیاب
جیسے بھی نبھ رہی ہے نبھائیں چراغ سے

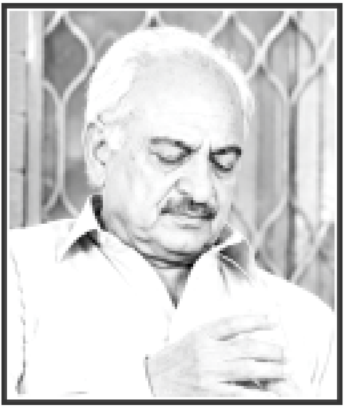

افتخار شاہد

# غزلیں

کہیں کہیں جو اُجالا دکھائی دیتا ہے
ہمارا اب بھی حوالہ دکھائی دیتا ہے

پرانی قدروں کے ایوان سونے سونے ہیں
کہ ان پہ دیر سے تالا دکھائی دیتا ہے

یہ زندگی ہے تو پھر موت کس کو کہتے ہیں
زمیں پہ عالمِ بالا دکھائی دیتا ہے

یہی نہیں کہ یہاں شب ہے چاندنی سے تہی
سحر کا رنگ بھی کالا دکھائی دیتا ہے

میں ظلمتوں کے مقابل ہوں اس لیے بھی جلیل
کہ ان کے بعد اُجالا دکھائی دیتا ہے

## احمد جلیل

یہی نہیں کہ کنائے اشارے کچھ بھی نہیں
وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم تو تمہارے کچھ بھی نہیں

ملی ہے اُن کو یہ توقیر تیری چوکھٹ پر
وگرنہ چاند یہ سورج، ستارے کچھ بھی نہیں

میاں! یہ عشق تو دل، جاں، جگر کا دشمن ہے
ملے ہیں تم کو جو اس میں خسارے کچھ بھی نہیں

بڑے مہیب ہیں حالات جانتا ہوں مگر
بجز دعاؤں کے بس میں ہمارے کچھ بھی نہیں

مرے لیے تو سبھی کچھ یہ میری کٹیا ہے
کسی کے اونچے یہ محل و منارے کچھ بھی نہیں

تعلق یہی ہے کہ اک جاں تھی اپنے پاس جلیل
سوائے اس کے محبت میں ہارے کچھ بھی نہیں

# غزل

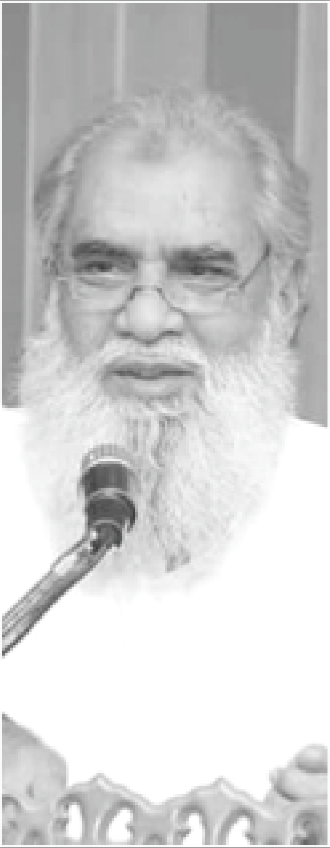

مدہوش کبھی ہوش میں آ جائے تو کیا ہو
خود اپنے کیے پر ہی وہ پچھتائے تو کیا ہو

وہ شخص کسی کو نہ کبھی گھاس جو ڈالے
وہ شخص اگر دام میں آ جائے تو کیا ہو

وہ بستی جہاں برسوں سے بارش نہ ہوئی ہو
اس بستی پہ گھنگھور گھٹا چھائے تو کیا ہو

وہ شخص کہ جس کی ہو ترے دل پہ حکومت
وہ شخص ترے دل سے اتر جائے تو کیا ہو

وہ شخص ملے پھر سے تجھے پہلے کی صورت
پھر خود کو زمانہ کبھی دہرائے تو کیا ہو

کل تک تمہیں جس شخص سے گھن آتی تھی اکرم
وہ شخص اگر آج تمہیں بھائے تو کیا ہو

**اکرم ناصر**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

ہم تری سمت کب بڑھے، ناک کی سیدھ چل پڑے
بے طلبی کی راہ میں، کوئی شجر نہیں تو کیا

# غزل

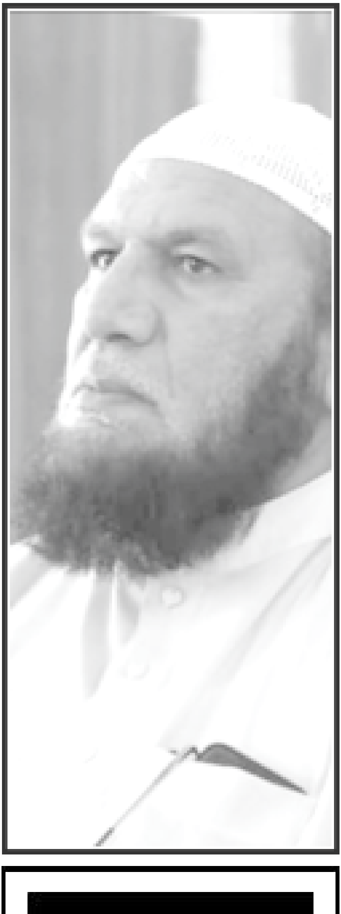

آنکھوں میں اٹک جائے نہ کیوں یاس کا منظر
ہے چاروں طرف غربت و افلاس کا منظر

کر دے نہ کہیں میری تمناؤں کے ٹکڑے
دلکش ہے تری آنکھوں کے الماس کا منظر

اشکوں نے بھگو دی ہیں سلیں درد کی بھاری
تھا سنگ کی بستی میں بھی احساس کا منظر

جب پہلے پہل نام ترا لکھا گیا تھا
اک قوسِ قزح تھا مجھے قرطاس کا منظر

شاخوں سے گرے پتوں سے پانی کی طلب ہے
دیکھے تو رضا کوئی مری آس کا منظر

رضا اللہ حیدر

انتخاب
**خالد احمد**
نعمان منظور

شہر کی دھول سمٹ آئی ہے کیوں آنکھوں میں
کچھ تو کہہ اب ترے دلگیر کہاں ہوتے ہیں

# غزل

اسی لیے تو یہ سارا نظام بیٹھ گیا
کہیں سے تخت پہ آ کر غلام بیٹھ گیا

وہ جس جگہ پہ کوئی ننگے سر نہیں جاتا
وہاں پہ حسن ترا بے نیام بیٹھ گیا

حلال رزق کمانا بڑا ہی مشکل ہے
جڑوں میں جیسے تمہاری حرام بیٹھ گیا

جنابِ عشق کی دعوت پہ رات میلے میں
فقیر میر کا گا کر کلام بیٹھ گیا

وہاں پہ اور کسی کا چراغ کیا جلتا
تمہارے قدموں میں ماہِ تمام بیٹھ گیا

اسی لیے تو یہ پانی بہت ہی میٹھا ہے
کنویں کے پاس کوئی خوش کلام بیٹھ گیا

ہما شما کے سروں پر وہ بیٹھتا کب تھا
ہمارے سر پہ ہما ایک شام بیٹھ گیا

خدا کا شکر ہمیں رینگنا تو آتا تھا
وہ راستے میں کہیں تیز گام بیٹھ گیا

یہ دل کو بات مری کیوں سمجھ نہیں آتی
دماغ دور سے کر کے سلام بیٹھ گیا

مسعود احمد

# غزل

خفا کس بات پر ہو کے نہ جانے
دیا بیٹھا ہے سورج کے سرہانے

سر آنکھوں پر مجھے اُس نے بٹھایا
میں خود آیا تھا جس کے ناز اُٹھانے

گرہ میں باندھ لی خوشبو گلوں نے
ہوا نکلی جو قسمت آزمانے

پرندوں کو محبت ہو گئی ہے
شجر یہ بات مانے یا نہ مانے

جب اپنے اوج پر طوفان پہنچا
اُٹھی اِک موج ناؤ کو بچانے

تو اک زندہ حقیقت ہے تو پھر کیوں
ہر اک کے لب پہ ہیں تیرے فسانے

بجا تیری روش اپنی ہے، لیکن
مری اپنی روش ہے، اے زمانے!

فلک ہے یا ورق تاریخ کا ہے؟
ستارے ہیں، کہ ہیں گزرے زمانے؟

چلے آئے گلوں سے لوگ جمشید
لہو کا آخری قطرہ بہانے

جمشید چشتی

# غزل

قفل دل پر ہے چابی ٹھیک نہیں
اب وہاں باریابی ٹھیک نہیں

خیر ہو ان کی ٹھیک ہوں صاحب
ان کی چٹھی جوابی ٹھیک نہیں

ہم ستاروں سے پوچھ لیتے ہیں
عشق میں بے حسابی ٹھیک نہیں؟

جیتے رہنا کسی کٹہرے میں
اتنی خود احتسابی ٹھیک نہیں

حالت عشق آشکارا نہ ہو!!
ایسی رنگت گلابی ٹھیک نہیں

دھیرے دھیرے گزار جیون کو
ریل جیسی ، شتابی ٹھیک نہیں

دل کا کیا ہے دراز آتی رہے
پھینک دیجیے رکابی ٹھیک نہیں

ساتھ تو نے سفر میں اس کی یاد
جو بغل میں ہے دابی ٹھیک نہیں

موج غم دل کے پار ہو جائے
آنکھ اتنی بھی آبی ٹھیک نہیں

رخ سے ہی روشنی کشید کریں
یہ کرن ماہتابی ٹھیک نہیں

یاد کے بوجھ سے بھی تھک جانا
اس قدر بھی نوابی ٹھیک نہیں

پھول رکھے رہیں کتابوں میں
یہ محبت کتابی ٹھیک نہیں

جھوٹ ہی جانئے گا اس کا سچ
ہے نشے میں شرابی ٹھیک نہیں

تجھ میں رخشندہ کیسے کیسے لوگ
ڈھونڈتے ہیں خرابی ٹھیک نہیں

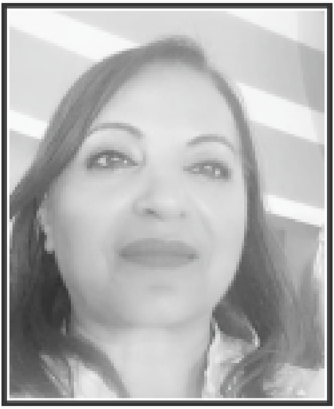

رخشندہ نوید

# غزل

تند ہوائیں چل پڑیں تھام لو بادبان کو
آؤ طنابیں کھینچ لیں خطرہ ہے سب کی جان کو

راہ نہیں بچی کوئی جس پہ حیات چل سکے
کوئی بھلا کہاں تلک منہ میں رکھے زبان کو

ہم نے تو پیٹ کاٹ کر اس کو کمان سونپ دی
اس نے ہماری سمت ہی سیدھا کیا کمان کو

خواہشیں کھا گئیں انہیں اور وہ ملک کھا گئے
جیسے کہ کوئی راہزن لوٹتا ہے دکان کو

شہر ہے اک حصار میں جبر کے اختیار میں
گوشۂ عافیت کوئی کوئی جگہ امان کو

میرے لہو کی سرخیاں اس کا جمال بن گئیں
اور وہ تنگ کر گیا مجھ پہ مرے جہان کو

دامِ وفا میں ہم نے بھی کاٹی ہے قید اس طرح
دل میں کبھی جو آئی تو پر نہ کھلے اڑان کو

سعد جی تپتی دھوپ میں ایک ہجومِ بے کساں
دیکھے ہے آسمان کو ترسے ہے سائبان کو

سعد اللہ شاہ

# غزلیں

یوں چلا آتا ہوں سب بھول کے، افسانے میں
جس طرح رِند پڑا ہو کوئی مے خانے میں

تھام کر ماضی کی اُنگلی کو مَیں چلتے چلتے
جا نکلتا ہوں کسی یاد کے ویرانے میں

مَیں تو حیراں ہوں، نہیں لوگ اُٹھاتے پتھر
جانے کیا ان کو نظر آ گیا دیوانے میں

اِسے عادت نہیں، بس میرا تساہل سمجھو
دیر ہو جاتی ہے اکثر مجھے گھر جانے میں

گلے ملتے ہوئے محتاط ہی رہیے، صاحب!
یار خنجر بھی چھپا لیتے ہیں دستانے میں

## اشرف نقوی

نکلا تھا دیکھنے کو میں گلزارِ کائنات
رستے میں آ گئی مرے، دیوارِ کائنات

یعنی تری نگاہ میں وقعت نہیں مری
یعنی میں سب سے بڑھ کے ہوں بے کارِ کائنات

اُس کو بشر نہیں، میاں خیرُالبشر کہو
جس پر خدا نے کھولے سب اسرارِ کائنات

سورج، ستارے چاند بھی بکنے کو آ گئے
ارزاں کچھ اِتنا ہو گیا بازارِ کائنات

دستِ ہنر بھی اس کو مکمل نہ کر سکا
سمجھے گا کوئی کس طرح آزارِ کائنات

ظاہر میں دیکھنے کو تو شاید نہ مل سکیں
باہر خلا سے ڈھونڈیے آثارِ کائنات

میں نائبِ خدا ہوں سو اُس واسطے مجھے
اشرف اٹھانا پڑ گیا ہے بارِ کائنات

# غزل

گویا سب کچھ ہی پا لیا ہم نے
اُس کو دل میں بسا لیا ہم نے

جیسے جلتے ہیں راستوں میں چراغ
اس طرح دل جلا لیا ہم نے

آج جی بھر کے ہم کو دیکھو تم
رُخ سے پردہ ہٹا لیا ہم نے

اُس کے جانے سے جو ہُوا ویراں
پھر وہی گھر سجا لیا ہم نے

آگہی بھی عذاب ہے افروز!
اُس سے دامن چُھڑا لیا ہم نے

**افروز رضوی**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

در بہ در گریہ کناں، طالب درماں کیوں ہیں؟
تیرے عشاق گرفتارِ غمِ جاں کیوں ہیں؟

# غزل

رنگوں کے گرداب میں ہے
ابھی مصور خواب میں ہے

خوشبو پالتی ایک کلی
چاہت بھرے گلاب میں ہے

اے جیون تیری تعریف
موت سے اگلے باب میں ہے

راجا نیّر اک تصویر!
خواہش کے برفاب میں ہے

ایک ضرورت لازم سی
لمحہ نایاب میں ہے

حسن ہویدا ہونا ہے
لیکن ابھی سراب میں ہے

نئی نسل سوال تیرا
بھٹکے ہوئے جواب میں ہے

لہو میں پھیلی ایک تلاش
عرصہ بے تاب میں ہے

راجا نیّر

# غزل

عصائے موسیٰ ہے جادوئی کرامات کے بعد
وزن ہے بات میں میری تمہاری بات کے بعد

وہ ایک پل کا ٹھہرنا گزرتے وقت کے بیچ
لگا نہ دل کہیں اُن کے تصورات کے بعد

اک انقلاب کی تجسیم ہونے لگتی ہے
شعورِ خلق سے پہلے، فتورِ ذات کے بعد

تمام دنیا میں جو کچھ تھا وہ نہیں بدلا
ہماری جیت سے پہلے تمہاری مات کے بعد

تمہاری عیش پرستی کو دیکھ کر سارے
کریں گے ڈاکہ زنی ہی گزراوقات کے بعد

بس ایک گہری خموشی ، اندھیرا ، سناٹا
دمِ حیات سے پہلے دمِ حیات کے بعد

ہر اک نے قصہ گھڑا مصنوعی ذہانت سے
زمانہ چال چلا ہے قلم دوات کے بعد

رنگوں کی خاصیت سمجھو نظامِ ہستی میں
تجربات سے پہلے مشاہدات کے بعد

کہاں کا دین، کہاں کی شرع، کہاں کے حکیم
کوئی بھی بُت نہیں ٹوٹا ہے سومنات کے بعد

**شبہ طراز**

# غزل

اک آئینے میں ہے عکس میرا جو میں نہیں ہوں
یہ عکس میں ہوں تو پھر جو میں ہوں وہ میں نہیں ہوں

میں جانتا ہوں کہ میں ہی میں ہوں چہار جانب
وہ چاہتا ہے کہ میں نہیں ہوں تو میں نہیں ہوں

یہ کیا عجب ہے کہ سب کا ہونے کو ہوں میسر
یہ کیا سبب ہے کہ اپنا ہونے کو میں نہیں ہوں

وہ میرے حق میں گواہی دیتا تو میں بھی ہوتا
مگر وہ کہتا ہے کہ میں نہیں ہوں لو میں نہیں ہوں

سیانے کہتے ہیں ہونا محض ایک واہمہ ہے
یہ واہمہ تو مجھے نہیں ہے سو میں نہیں ہوں

ہے فرقِ بود و نبود سمجھو تو صرف اتنا
کہ جتنے تم ہو عزیز ساگر کو میں نہیں ہوں

دکھائی دیتا ہے جو بہ ہر سُو وہ تو نہیں ہے
جو دیکھ سکتا ہے تجھ کو ہر جا وہ میں نہیں ہوں

مجھے سمجھتا ہے کون مجھ سے زیادہ ساگر
میں کہہ رہا ہوں کہ میں نہیں ہوں تو میں نہیں ہوں

مجھے یہ کارِ جہاں بُھلا پائے یاد تیری
تُو جانتا ہے کہ اتنا سیدھا تو میں نہیں ہوں

یہ آئینہ خانہ خواب کا ہے کہ تیرے دل کا
جہاں پہ ہر سمت میں ہی میں ہوں گو میں نہیں ہوں

یہ یاد رکھنا کہ جس کے کُن کا طلسم ہوں میں
اگر وہ چاہے تو وہ بھی ہُوں میں جو میں نہیں ہوں

محمد سلیم ساگر

# غزل

نہ سمجھیں جو مشیت کے اشارے ڈوب جاتے ہیں
سہارے کی ضرورت میں سہارے ڈوب جاتے ہیں

ہزاروں خواہشیں ہیں موجزن اس بحرِ ہستی میں
اُٹھے طوفان تو اکثر کنارے ڈوب جاتے ہیں

ہوس جب حد سے بڑھتی ہے وڈیروں زر پرستوں کی
تو اُلٹی گنگا بہتی ہے اِدارے ڈوب جاتے ہیں

سمندر حق پرستوں کے قدم گیلے نہیں کرتا
جو دشمن ہوں تعاقب میں وہ سارے ڈوب جاتے ہیں

کبھی شوخی پہ اتراتے ہیں منظر عشق و مستی کے
کبھی اُن جھیل سی آنکھوں میں سارے ڈوب جاتے ہیں

ہمارا عشق ناممکن کو کر دیتا ہے جب ممکن
تو پتھر تیرتے ہیں اور غبارے ڈوب جاتے ہیں

دکھاتا ہے سرابِ جستجو ایسے مناظر بھی
لبِ دریا کھڑے کچھ غم کے مارے ڈوب جاتے ہیں

ملے جب کاروبارِ عشق میں اِک لمس نظروں کا
منافعے کے سمندر میں خسارے ڈوب جاتے ہیں

سحرؔ وہ حُسن کا سورج اُٹھائے جب نقاب اپنا
تو جلووں میں زمیں کے چاند تارے ڈوب جاتے ہیں

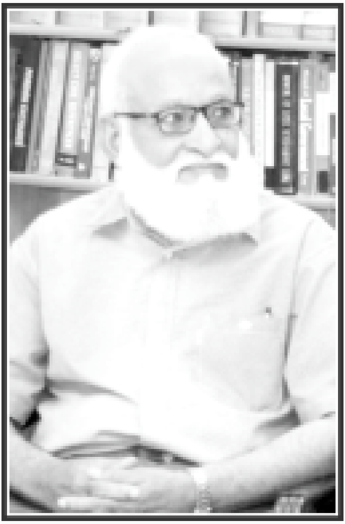

**اکرم سحر فارانی**

# غزل

ایسا نہیں کہ یوں ہی وفا کر رہا ہوں میں
میرے ضمیر نے جو کہا، کر رہا ہوں میں

تسلیم کے دیار میں اِنکار بانٹ کر
جو قرض تھا وہ قرض ادا کر رہا ہوں میں

اب میرا اِختلاف نِصابوں میں آ گیا
کچھ لوگ کہہ رہے تھے خطا کر رہا ہوں میں

آخر مجھے سکون ملا اپنی ذات میں
ویسے کسی کے دل میں بھی جا کر رہا ہوں میں

ہم دونوں ماحصل میں برابر شریک ہیں
تم کام کر رہے ہو، دعا کر رہا ہوں میں

میری شکایتوں پہ نہ بیگانہ وار دیکھ
اپنا سمجھ کے تجھ سے گِلہ کر رہا ہوں میں

جب لوگ پوچھتے ہیں یہ کیا کر رہے ہو تم
میں خود سے پوچھتا ہوں، یہ کیا کر رہا ہوں میں

تعمیر کر کے روز اُداسی کا اِک مکاں
تنہائیوں کا شہر بڑا کر رہا ہوں میں

میں چاہتا ہوں مجھ میں فقط خالی پن رہے
ارض و سما کو دل سے جدا کر رہا ہوں میں

نو سال ایک چاک گھماتا رہا مجھے
نو سال ایک حُسن کا چاکر رہا ہوں میں

چوٹی سے چوٹ کھا کے میں گھاٹی میں آ گرا
آدم کے واقعے کو نیا کر رہا ہوں میں

کر کے رہا ہوں چاک تری پردہ داریاں
لوگوں کو ساری بات بتا کر رہا ہوں میں

تجھ کو یہ لگ رہا ہے مجھے قید کر دیا
خلقت کے دل میں جا کے پتہ کر رہا ہوں میں

اُن کی برائیوں کا اُنہیں بھی پتہ چلے
نیز بُروں کے ساتھ بھلا کر رہا ہوں میں

شہزاد نیّر

# غزل

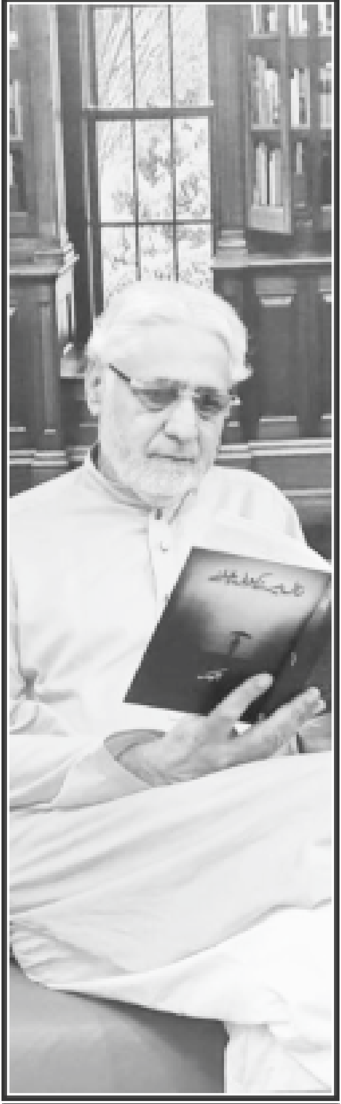

کسی سے دل لگانے کی سزا دیتی ہے یہ دُنیا
گھڑی بھر مسکرانے کی سزا دیتی ہے یہ دُنیا

اگر دو گیت الفت کے کوئی گا لے تو کیا ہو گا
وفا کے گیت گانے کی سزا دیتی ہے یہ دُنیا

یہاں اک پل بھی رہنا ہے تو غم سے دوستی کر لو
خوشی سے جھوم جانے کی سزا دیتی ہے یہ دُنیا

اگر جینا ہے دُنیا میں تو سر اپنا جھکا رکھو
وگرنہ سر اُٹھانے کی سزا دیتی ہے یہ دُنیا

یہاں دستور ہے، کانٹوں کو سینے سے لگا رکھنا
گلوں کے پاس جانے کی سزا دیتی ہے یہ دُنیا

یہاں طالب کا ہے مطلوب سے ملنا بہت مشکل
یہاں ملنے ملانے کی سزا دیتی ہے دُنیا

یہ بستی چھوڑ کر اقبال جاؤ گے کہاں آخر
نئی بستی بسانے کی سزا دیتی ہے یہ دُنیا

**اقبال سروبہ**

# غزل

گھر کے سارے روزن چپ ہیں گھر کی اک اک کھڑکی چپ
اک مدت سے اپنے صحن میں پھیلی ہے اک لمبی چپ

دُنیا نے اک حشر اُٹھایا ہے اپنی آوازوں سے
میرے چاروں اور خموشی میرے ساتھ اکیلی چپ

برسوں اور نظر نے دیکھا چاند فلک کے زینے پر
برسوں اور تمنا جاگی کروٹ لے کے ٹوٹی چپ

ایک قیامت برپا کر دی اس بے درد زمانے نے
ایک جمود کو میں نے توڑا میں نے جس دم اُلٹی چپ

جانے کون سا موسم اُترا جانے کیسی چھائی رُت
ہر جانب ہے ایک خموشی ہر جانب ہے ٹھہری چپ

ایک زمانہ جس کی خاطر درد اُٹھائے فرقت کے
اُس نے ایک نظر جب دیکھا مجھ کو جیسے لگ گئی چپ

گلی گلی آواز لگائی میں نے جس کی خواہش میں
اُس دروازے سے ٹکرا کر میری جانب لوٹی چپ

وقت نے ہم کو لاکھ پکارا وقت نے لاکھ دُہائی دی
پھر بھی اپنا خوف نہ ٹوٹا پھر بھی دوست نہ ٹوٹی چپ

جس سے بات نبیل چلائی جس سے پوچھا اُس کا دُکھ
آدھی لب پر ایک صدا تھی، لب پر تھی اک آدھی چپ

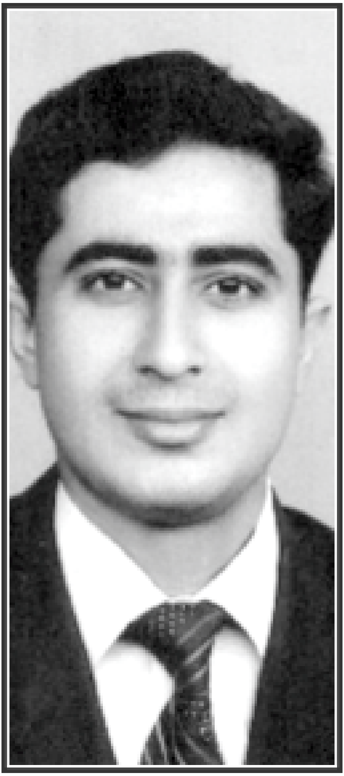

نبیل احمد نبیل

# غزل

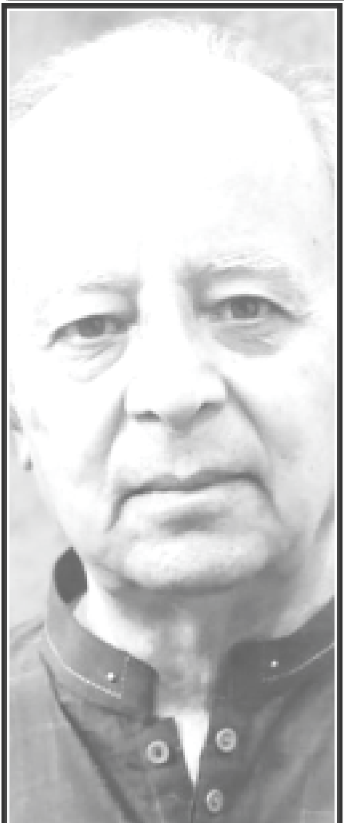

**سمیع اللہ عرفی**

یاد کے سیلاب نے سب مسئلے حل کر دیے
دل کے صحرا آنکھ کے بادل نے جل تھل کر دیے

ایک بھی لمحہ ندامت کا نہ ابھرا ذات سے
آئینے اس نے میرے مدِمقابل کر دیے

تو کہ میری ذات میں تحلیل ہو کر رہ گیا
تیری خوشبو نے میرے احساس ہی شل کر دیے

پھر تیری نظروں سے ابھرا نہ کبھی کوئی سوال
جب جوابوں نے میرے سب مسئلے حل کر دیے

نفرتیں فصلوں میں پل کر نسل میں ڈھلتی گئیں
اگلے پیڑوں نے بھی جانے کیسے کیسے پھل دیے

اس قدر نفرت نہ تھی عرفی کہ میں نہ سوچتا
رنگ رسوائی تیری چہرے پہ کس نے مل دیے

# غزل

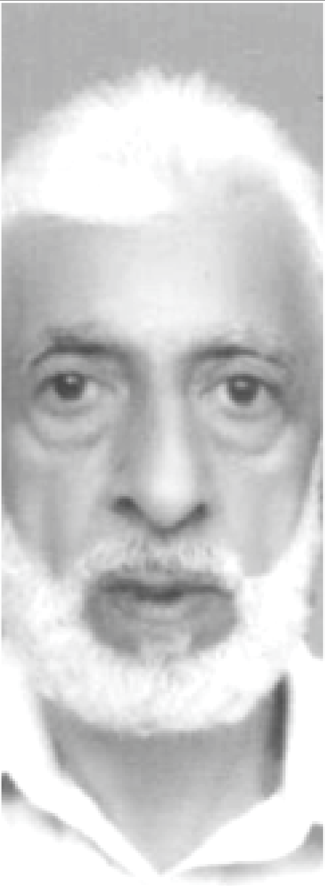

اک عذابِ بے کراں ہے اور میری زندگی
امتحاں در امتحاں ہے اور میری زندگی

لے گیا جو چھین کر مجھ سے میری ہر آرزو
وہ غبارِ کارواں ہے اور میری زندگی

اور تو کچھ بھی نہیں ہے کھیل ہے تقدیر کا
ہر سفر کارِ زیاں ہے اور میری زندگی

کس طرح چومیں گی یارو منزلیں میرے قدم
دشمنی پہ آسماں ہے اور میری زندگی

حادثہ کیسے ہوا یہ کب ہوا میں کیا کہوں
مے کشوں کے درمیاں ہے اور میری زندگی

ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں خون میں ڈوبے بدن
ہر طرف آہ و فغاں ہے اور میری زندگی

تھی جہاں پازیب کی چھن چھن چھنن شاہد کبھی
آج وہ خالی مکاں ہے اور میری زندگی

**ہمایوں پرویز شاہد**

# غزل

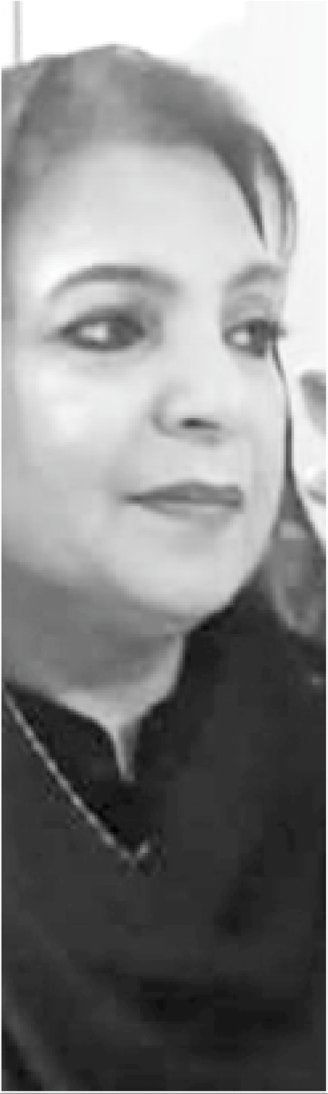

اک عمرِ ریاضت کا ثمر داغِ محبت
مٹ جائے گا ہر رنگ مگر داغِ محبت

لو دیتے ہیں مانندِ قمر داغِ محبت
دیتے ہیں مرے غم کی خبر داغِ محبت

ہیں سوختہ جاں آج ترے ظلم گزیدہ
دل زخمِ فروزاں تو جگر داغِ محبت

ہر شام کے ماتھے پہ چمکتا ہے مہِ غم
زندانِ وفا رات ، سحر داغِ محبت

ایوانِ دل و جان میں تمغوں کی طرح سے
رکھے ہیں بہ چشم اور بہ سر داغِ محبت

پیہم ہے جواں آنکھ میں اشکوں کی روانی
رہتے ہیں سدا محوِ سفر داغِ محبت

جب اشک بہاتے ہیں یہ بادل بھی مرے ساتھ
ایسے میں سلگ اُٹھتا ہے ہر داغِ محبت

خالدہ انور

# غزل

اعجاز روشن

عاشقی کا سلسلہ چلتا رہے
یہ شجر اب پھولتا پھلتا رہے

کوئی تبدیلی نہیں مجھ کو قبول
زندگی دریا ہے تو دریا رہے

کرمکِ شب تاب کے پیچھے کوئی
روشنی کی کھوج میں اڑتا رہے

زیست کی شب میں کسی جگنو کی مثل
ہر کوئی جلتا رہے بجھتا رہے

غم کی گرمائش سے دل کا برف زار
قطرہ قطرہ آنکھ سے بہتا رہے

کائی رہتی ہے نہ روشن دل میں میل
غم کا دریا جن دنوں بہتا رہے

---

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غموں کا زہر کب سے پی رہے ہیں
نہ جانے کس طرح ہم جی رہے ہیں

# غزلیں

ڈال مت لفظ کی ہر وعدہ خلافی مجھ پر
جیسے اتری ہے فقط معنی طوافی مجھ پر

آخری بار محبت مجھے کر لینے دے
قرض ہے پہلی محبت کی تلافی مجھ پر

مجھ سے دکھ اپنا بیاں ہو نہیں پاتا یکسر
لکھ فریدا کوئی مغموم سی کافی مجھ پر

ہو کے مجبور تری ضد سے پہن تو لی تھی
تنگ ہے آج بھی پوشاک معافی مجھ پر

تو میری روح پہ اشلوک جہاں بھر کے نہ لکھ
ڈھائی اکشر ہی کی تحریر ہے کافی مجھ پر

مجھ سے ہوتی ہے شروع اہلِ محبت کی سرشت
ختم ہے اشک گری، آرزو بافی مجھ پر

کم نہیں اس کو بچا لینے کی شدت بھی انیم
بوجھ ہے اپنی حفاظت کا اضافی مجھ پر

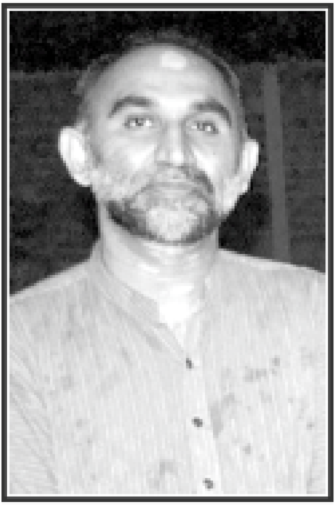

## ابوطالب انیم

غرقاب ہو، گرداب تمنا سے نہ ابھرے
دل، کاش، کبھی کاش کی دبدھا سے نہ ابھرے

زیریں طلبی تو نے ڈبویا ہمیں آخر
اک بار جو ڈوبے تو دوبارہ سے نہ ابھرے

خوشبو سے سبو بھر کے بھی ہم غرق تنفس
کس چاہ میں چاہِ لب بالا سے نہ ابھرے

اس پار ہمارا کوئی ساتھی ہی نہیں تھا
ہم ہیں وہ گھڑے جو کسی دریا سے نہ ابھرے

آنکھوں میں تری ایسے سرابوں کی چمک ہے
اے تشنہ لبی جو کسی صحرا سے نہ ابھرے

کیوں پوچھتا ہے کیسے اترتے رہے زینے
کیا تجھ سے کہیں ہم بھی کہ کس کیا سے نہ ابھرے

بے رنگ ہے بے کیف ہے بے لطف ہے صاحب
وہ حسن عمل جو کسی توبہ سے نہ ابھرے

معنی تو اترتے ہی رہے حرف پہ پیہم
لیکن وہ انیم آذری انشا سے نہ ابھرے

# غزل

محمد نوید مرزا

درویش ، قطب ، ابدال گئے
مشکل میں ہمیں وہ ڈال گئے

دنیا کی حقیقت جب پوچھی
باتوں باتوں میں ٹال گئے

کیا خوب گھڑی تھی رخصت کی
اشکوں میں ستارے ڈھال گئے

ماضی میں انھیں کھویا دیکھا
جب پوچھنے ان کا حال گئے

اے رقاصہ یہ بات بتا
کیوں تیرے سبھی سر تال گئے

سب وقت کی دھول میں ختم ہوا
لمحوں میں کتنے سال گئے

قصہ اس حسن کا ختم ہوا
میرے بھی خدوخال گئے

# غزل

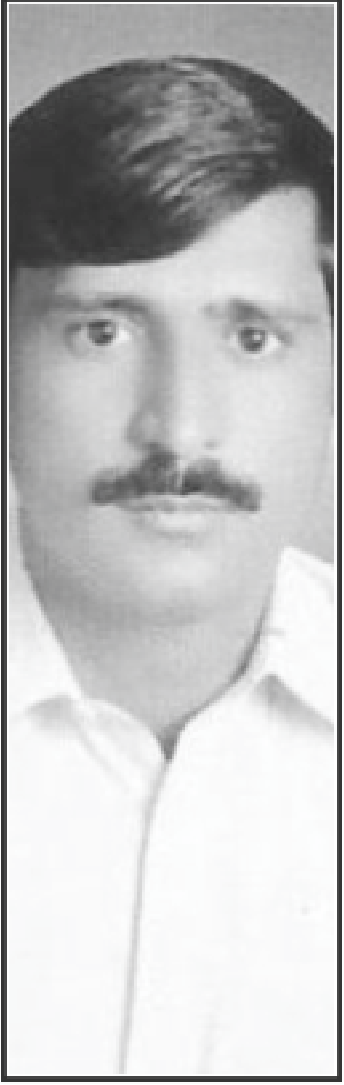

کوئی محروم تمنا نہیں ہونے والا
پھر وہ عالم کبھی برپا نہیں ہونے والا

وقت جتنا بھی بدل جائے بدلنے دے اسے
عشق کا رنگ پرانا نہیں ہونے والا

رات ڈھل جائے سحر آئے اجالا پھیلے
درد کا کوئی مداوا نہیں ہونے والا

تم اگر چھوڑ بھی جاؤ تو کوئی بات نہیں
دل کسی اور کا شیدا نہیں ہونے والا

ہم نے خاموشی کو آواز بنا رکھا ہے
اب کوئی حرف بھی بے جا نہیں ہونے والا

اپنی خود داری کو نیلام نہیں کر سکتے
دل کسی در پہ بھی رسوا نہیں ہونے والا

وقت نے چھین لیے خواب ہمارے دانش
اب کوئی خواب بھی تازہ نہیں ہونے والا

**اعجاز دانش**

# غزلیں

رُخ جس کا نہیں وقت کی رفتار کی جانب
کچھ دیر کو چلتے ہیں اسی غار کی جانب

منظر یہ مکانوں کی سمجھ میں نہیں آتا
بازار چلے آتے ہیں بازار کی جانب

اب بجھتے ہوئے حال کی اٹھتی ہیں نگاہیں
ماضی کے چمکتے ہوئے آثار کی جانب

آنگن میں اترنے لگے صد رنگ ستارے
اک چاند نے دیکھا درو دیوار کی جانب

لفظوں نے ذرا پال کے آزاد جو چھوڑا
لوٹے نہ معانی کبھی اشعار کی جانب

مسند کوئی خالی نہ بغاوت کی فضا ہے
کیوں آپ چلے جاتے ہیں دربار کی جانب

بٹتے ہوئے مٹ جائے گا اک روز قبیلہ
سب دیکھتے رہ جائیں گے سردار کی جانب

## افتخار الحق

کہیں ملے تو ہمیں اس جہان کا رستہ
ذرا یقین کا تھوڑا گمان کا رستہ

نتیجہ ملنے کی مسدود ہیں سبھی راہیں
کھلا ہوا ہے مگر امتحان کا رستہ

بہت قریب سے دیکھا تو انکشاف ہوا
بہت طویل ہے گھر سے مکان کا رستہ

یہ سوچ کر وہ بدلتا ہے رنگ ہر لمحہ
زمین ڈھونڈ نہ لے آسمان کا رستہ

مٹا رہا ہے حقیقت کی رہگزر کوئی
بنا رہا ہے کوئی داستان کا رستہ

نجانے کیسے گرے تھے پروں پہ کچھ دانے
پرندہ بھول گیا ہے اڑان کا رستہ

نظر کی سانس جو پھولی تو کھل گیا منظر
سراب تھا جسے سمجھا ڈھلان کا رستہ

# غزلیں

گھر میں رحمت ہیں مری بیٹیاں، راحت بیٹا
میں نے مالک سے یہی مانگی تھی دولت بیٹا

اپنے کردار کی چادر کو بچا کر رکھنا
تُو نے رکھنی ہے مرے بڑوں کی عظمت بیٹا

میں نے اس واسطے روکا نہ سفر سے تجھ کو
میرے اپنوں کی روایت ہے یہ ہجرت بیٹا

جب مقدر کے تھپیڑوں سے ہے پالا پڑتا
کام آتی نہیں کوئی بھی ذہانت بیٹا

جا کے پردیس میں احساس ہوا ہے تجھ کو
میں تو کہتا تھا بہت ہوگی مشقت بیٹا

دانہ پانی تو مقدر کا ملا کرتا ہے
ایک جیسی تو نہیں ہوتی ہے قسمت بیٹا

میں جو حالات سے ہارا نہیں اب تک ارشد
ٹُوٹنے دیتا نہیں ہے مری ہمت بیٹا

## ارشد محمود ارشد

ماں اور باپ کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے
بیٹا سب کا راج دُلارا ہوتا ہے

بہنیں اُس کے نام کا کلمہ پڑھتی ہیں
بھائی اُن کا ایک سہارا ہوتا ہے

مجبوری میں ہجرت کرنی پڑتی ہے
اپنا دیس تو سب کو پیارا ہوتا ہے

اُس کے اُلجھے گیسو دل دہلاتے ہیں
جس کو ہم نے آپ سنوارا ہوتا ہے

رفتہ رفتہ سارے چہرے کھلتے ہیں
کہنے کو ہر ایک ہمارا ہوتا ہے

جس نے اپنے سپنے پورے کرنے ہوں
اُس نے اپنی،، میں،، کو مارا ہوتا ہے

کیا بتلاؤں ارشد اُس پردیسی کو
تجھ بن کیسے یار گزارا ہوتا ہے

# غزل

جب تلک میں بھی کسی کی رہنمائی میں رہا
لامکاں کا فاصلہ میری رسائی میں رہا

زندگی میں نے گزاری ہے کسی کی قید میں
دیکھنے والے یہ کہتے ہیں رہائی میں رہا

اب کہیں جا کر اجل نے جان چھڑوائی مری
مدتوں اہلِ زمانہ کی خدائی میں رہا

زندگی کرنا جہاں تعزیر ٹھہرائی گئی
میں وہاں پر زندگی جیسی برائی میں رہا

عابدی جب تک دیارِ عشق سے نکلا نہیں
اُس گھڑی تک وہ مکمل پارسائی میں رہا

**علی حسین عابدی**

---

شام تو ہم نے کر لی مگر
تجھ بن کیوں کر ہو گی سحر

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

# غزل

ہم سفر میں تجھے بھی رختِ سفر جانا تھا
دھوپ کو سایہ تو سورج کو شجر جانا تھا

خشک پتوں کو اڑائے لیے پھرتی تھی ہوا
اُن کو اڑنا تھا مگر ہم کو ٹھہر جانا تھا

آگ کا کھیل ضروری تو نہیں ہے کہ ہمیں
لے کے سورج کو ہتھیلی پہ گزر جانا تھا

یوں بکھر کر تری محفل سے نکل آئے تھے ہم
جیسے بہتے ہوئے دریا کو اُتر جانا تھا

اب تصور میں اُسی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے تھے
ہم نے پیپل کو ترا یاد نگر جانا تھا

اب وہاں دھول سی اڑتی نظر آتی ہے ہمیں
جس کو منزل کے لیے راہ گزر جانا تھا

دیکھ کر اک تری تصویر مری آنکھوں کو
اشک بن کر سرِ قرطاس بکھر جانا تھا

تو نہیں تھا تو مرے رنگِ سماعت نے یہاں
تیری آواز کو جینے کی خبر جانا تھا

وہ تو تنہائی میں میری طرح روتا ہوگا
اور غازی مری آنکھوں ہی کو بھر جانا تھا

عون الحسن غازی

# غزل

منزل ہے کہیں اور، سفر اور طرف ہے
دل اور طرف، راہ گزر اور طرف ہے

یہ درہم و دینار سے راضی نہیں ہو گا
یعنی ترے سائل کی نظر اور طرف ہے

تیرے لئے یہ آنکھ کا رستہ نہیں چھٹا
اے عشق تری راہ گزر اور طرف ہے

کیا جنگ ہے جس جنگ پہ حیران ہے دنیا
سب اور طرف، ایک ہی گھر اور طرف ہے

یہ وقت ہے درباری و دربار پہ بھاری
جب سارے کا سارا ہی نگر اور طرف ہے

سب جنّ و ملائک ہیں عزازیل کی صف میں
اک صف میں صغیر ایک بشر اور طرف ہے

**صغیر احمد صغیر**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

قربتوں کی لَو ذرا آہستہ بڑھا
دیکھ، اے جاں! دیکھ، خاکستر ہوا جاتا ہوں میں

# غزل

زیادہ ہی مصروف اب ہو گئے ہو
کہ یوں مدتوں بعد مجھ سے ملے ہو

مجھے چھوڑنے کا ارادہ ہے شاید
ذرا الجھے الجھے سے تم لگ رہے ہو

فرازِ انا پر چلو تم سنبھل کر
زمانے سے آگے نکلنے لگے ہو

نظر آ گئی خاص کیا بات مجھ میں
جو تم میری تعریف کرنے لگے ہو

مری بات کوئی بری لگ گئی کیا
اچانک ہی اٹھ کر جو تم چل دیے ہو

بھلا کر سبھی عہد و پیمان اپنے
ہماری نگاہوں سے کیوں گر رہے ہو

ہے بے جا ترقی کا دعویٰ عزیزو!
جہاں تم کھڑے تھے وہیں پر کھڑے ہو

نمایاں ہے ہر چیز میں عکس تیرا
بظاہر مری آنکھ سے تم چھپے ہو

میں اظہارِ الفت پہ پچھتا رہا ہوں
تم انکارِ چاہت پہ پچھتا رہے ہو

ملے گی انھیں بھی مقدر کی روزی
منڈیروں سے طائر اڑا کیوں رہے ہو

مرے پاس غم کے سوا کچھ نہیں ہے
مرے کھوج میں تم عبث چل پڑے ہو

سرور فرحان

# غزل

جوابِ کبریا کوئی نہیں ہے
مثالِ مصطفیٰ کوئی نہیں ہے

وُہی واحد، احد، حق وحدہٗ ہے
قسم سے دُوسرا کوئی نہیں ہے

جو دیکھا جائے وحدت کی نظر سے
تو پھر اچھا بُرا کوئی نہیں ہے

حقیقت کیا سمجھ آئے گی اُس کو
جسے اپنا پتا کوئی نہیں ہے

یزیدی دندناتے پھر رہے ہیں
شہیدِ کربلا کوئی نہیں ہے

وُہ شہ رگ سے بھی ہے نزدیک اے دِل
کریں کیا، دیکھتا کوئی نہیں ہے

ہم اپنی راہ میں ہیں آپ حائل
حجابِ ماسوا کوئی نہیں ہے

جدھر بھی دیکھئے، بس وُہ ہی وُہ ہے
شہنشاہ و گدا کوئی نہیں ہے

اُسی کی بھیک ہے، کاسہ اُسی کا
فقیر و بادشاہ کوئی نہیں ہے

سمندر سے اگر ہو جائے واصل
تو قطرے کو فنا کوئی نہیں ہے

مصور، جلوہ گر تصویر میں ہے
تصور غیر کا کوئی نہیں ہے

حقیقت یوں تو سارے جانتے ہیں
حقیقت مانتا کوئی نہیں ہے

عطاؤں پر عطائیں، اللہ اللہ!
خطاؤں کی خطا کوئی نہیں ہے

الستی مے پلا ساقی دوبارہ
شرابوں میں مزہ کوئی نہیں ہے

وصالِ یار ہے مقصودِ عاشق
طلب یا مدعا کوئی نہیں ہے

رضائے یار پر ہم تو ہیں راضی
یہاں شکوہ گِلہ کوئی نہیں ہے

وُہی حق ہے جو مرضی یار کی ہے
مجازی تبصرہ کوئی نہیں ہے

نہ یوں فیضانؔ، مخفی راز کھولو
تمہیں خوفِ خدا کوئی نہیں ہے

**فیض رسول فیضان**

# غزل

ہجر وہ کتنا خوشنما ہو گا
درد ہی درد کی دوا ہو گا

عادتیں چھوٹتی نہیں جلدی
یاد تو وہ بھی کر رہا ہو گا

راس تھی اسکو اپنی تنہائی
خود ہی دامن چھڑا گیا ہو گا

دل میں بے نام سی خلش ہے کیوں
راستہ خواب سے جدا ہو گا

ہم نے ڈھونڈا نہیں اسے لیکن
اس نے ڈھونڈا جگہ جگہ ہو گا

خامشی درد سے عبارت ہے
کچھ کہا گر تمہیں گلہ ہو گا

سوچتا کاش وقت رخصت وہ
وہ نہ ہو گا تو میرا کیا ہو گا

نائلہ راٹھور

---

انتخاب
خالد احمد
نعمان منظور

روح کی صورت سچ کو ملی ہے قید میں بھی آزادی
کھنک چھنک کر رہ جاتی ہیں زنداں میں زنجیریں

# غزل

دن کو مشکل ہو تو در پردۂ شب ہوتا ہے
تیری دنیا میں مرے مالکا! سب ہوتا ہے

اتنا دشمن بھی نقصان نہیں کر سکتا
جتنا نا اہل قیادت کے سبب ہوتا ہے

کوئی مرعوب ہے منصب سے کوئی دولت سے
کم ہیں وہ لوگ جنہیں پاسِ ادب ہوتا ہے

حسن غصے میں تحیر میں کہ سرشاری میں ہو
رنگ چہرے پہ جو آتا ہے غضب ہوتا ہے

یا تو دنیا بڑی عیار ہے یا سادہ ہوں میں
جو بھی ہوتا ہے مرے ساتھ عجب ہوتا ہے

اسی تاویل سے لٹتے رہے سب سادہ مزاج
مانعِ راہِ غلط نام و نسب ہوتا ہے

صرف لفاظی سے ہی چاشنی آتی نہیں ہے
کوئی اسلوب کوئی بات کا ڈھب ہوتا ہے

بے نیاز ایک زمانے سے یہی سوچ کے ہوں
جب کوئی بھی نہیں ہوتا ہے تو رب ہوتا ہے

دشمنِ جاں سے بھی کیا دشمنی رکھیں جاذب
سامنے والا اگر جان بہ لب ہوتا ہے

اکرم جاذب

# غزل

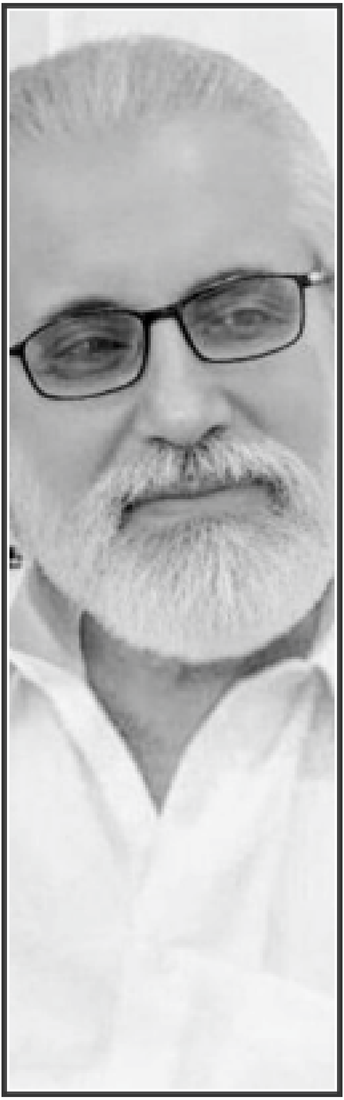

لوگ ایسے بھی پیار دیتے ہیں
پھول مانگو تو خار دیتے ہیں

زہر کھانے کی کیا ضرورت ہے
اب تو لہجے ہی مار دیتے ہیں

یوں لگائیں وہ آنکھ میں سرمہ
جیسے خنجر کو دھار دیتے ہیں

دُور منزل اُنہی سے ہوتی ہے
رَہ میں ہمّت جو ہار دیتے ہیں

کون رُکتا ہے پھر وہاں پیارے
گور میں جب اتار دیتے ہیں

جھیل ، ساگر ، شراب ، پیمانہ
اُس کی آنکھوں پہ وار دیتے ہیں

لوگ ایسے بھی ہیں یہاں افضل
زیست تنہا گزار دیتے ہیں

افضل ہزاروی

# غزل

پھول جھڑنے لگے ہیں شاخوں سے
رنگ اڑنے لگے ہیں چہروں سے

سارا ماحول خوب صورت ہے
ساری خوشبو ہے ان کی سانسوں سے

سب لٹایا ہے ان کے پیروں میں
جو کمایا تھا اپنے ہاتھوں سے

اپنے لہجے کو با وضو کر لیں
بات کرنی ہے ان کی آنکھوں سے

جنگ اب ناگزیر ہے اصغر
لوگ چڑنے لگے ہیں باتوں سے

**اصغر علی بلوچ**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

دیکھتے ہی دیکھتے، آنکھوں میں بس جاتا ہوں مَیں
جاگتی آنکھوں کچھ ایسے خواب دِکھلاتا ہوں مَیں

# غزل

رہتی ہے جو دنیا ابھی برباد ہماری
ہوتی ہے نئے ڈھنگ سے ایجاد ہماری

ویسے تو مقید ہے مگر شہر میں تیرے
پھرتی ہے نظر چار سُو آزاد ہماری

دُھندلے سے خدوخال، کہیں ابر کا ٹکڑا
کھڑکی سی کھلی ہے یہ کوئی یاد ہماری

ہوتی ہے خوشی کوئی سبب بھی نہیں ہوتا
رہتی ہے طبیعت کبھی ناشاد ہماری

بنجر تھی زمیں آنسو تری یاد کے بوئے
اور لفظوں کی کھیتی ہوئی آباد ہماری

کٹ جائے گا اُس منظر و ماحول سے وہ بھی
آ جائے گی اک روز اُسے یاد ہماری

تکلیف وہ ہوتا تو ظہور اپنی جگہ پہ
ورنہ یہی تنہائی ہے اُستاد ہماری

ظہور چوہان

# غزل

تھوڑا تھوڑا ہوں فرشتہ، تھوڑا تھوڑا آدمی
چاہتا ہوں میں کہ بن جاؤں سراپا آدمی

ڈھونڈتا پھرتا ہوں خود میں ایک ایسا ہم نفس
جو نہ زاہد ہو، نہ عابد، بس ہو اچھا آدمی

احسنِ تقویم کے درجے پہ فائز تھا کبھی
میں ہمیشہ سے نہیں تھا ایسا ویسا آدمی

کوزہ گر نے روح اپنی پھونک دی تھی خاک میں
تب کہیں مٹی سے نکلا میرے جیسا آدمی

جس نے نفرت چھوڑ کر مذہب محبت کا چنا
میں ہی تھا اپنے قبیلے کا وہ پہلا آدمی

بس اسی اک آس پر اس سے نبھاتا رہ گیا
راہ پر آ جائے گا وہ بھولا بھٹکا آدمی

میں ابھی اس سوچ میں تھا میرے جیسا کون ہے؟
"دفعتاً آئی صدا مجھ میں سے "تجھ سا آدمی؟

نامکمل آدمی تھے چار سو بکھرے ہوئے
کوئی گونگا آدمی تھا، کوئی بہرا آدمی

اک عجب تجرید کی حالت میں تھے ہم مبتلا
کوئی آدھا جانور تھا، کوئی آدھا آدمی

ارتقا کی ابتدائی منزلوں پر ہیں ابھی
بن ہی جائیں گے کسی دن رفتہ رفتہ آدمی

نام بجھنے کا نہیں لیتی مری مٹی کی پیاس
پی گئی یہ خاک کیسے کیسے دریا آدمی

حیف ان سا دوسرا پیدا نہیں کوئی ہوا
حیف ہم نے مار ڈالے کیسے عنقا آدمی

سوچتا ہوں کیا بھلا اس سے تقابل تھا مرا؟
وہ سراپا سروِ قامت اور میں چھوٹا آدمی

میرے دشمن کی محبت میں ہے جادو کا اثر
میں جسے ملتا ہوں وہ لگتا ہے اس کا آدمی

تیرنا آتا ہے پھر بھی ڈوبنا طے ہو چکا
اب کے میرے سامنے ہے ایک گہرا آدمی

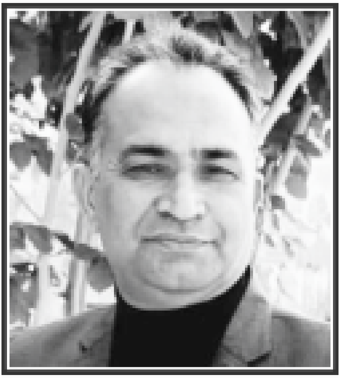

علمدار حسین

# غزل

جب جنوں میں جینے کا ساماں نظر آنے لگا
زیست کا ہر راستہ آساں نظر آنے لگا

دور سے آسودۂ عشرت جسے سمجھا تھا میں
پاس سے وہ کشتۂ حرماں نظر آنے لگا

جب بھی تنہائی میں تیری یاد کا دریا چڑھا
مجھ کو اپنی موج میں طوفاں نظر آنے لگا

بجھ گئے ایک ایک کر کے جب تمنا کے چراغ
دل تو کیا سارا جہاں ویراں نظر آنے لگا

محسن اُس نے سات پردوں میں نہاں رکھا جسے
عشق کو وہ حسن بھی عریاں نظر آنے لگا

**میتھیو محسن**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

دشمنوں میں تمہی نہیں یکتا
شہر میں دوست ہیں ہمارے بھی

# غزل

ہم عشق کے آزار سے باہر نہیں نکلے
اک درد کے اظہار سے باہر نہیں نکلے

دیکھو تو بہت دور نظر آتے ہیں ہم تم
ہم پھر بھی ترے پیار سے باہر نہیں نکلے

اک سحر تھا جادو تھا کہ کیا تھا نہیں معلوم
ہم اب بھی ان اسرار سے باہر نہیں نکلے

کر سکتے ہیں کیا آج وہ آیات کی تفسیر
جو جبہ و دستار سے باہر نہیں نکلے

کیا جانیں گے وہ قیمت و قدر اپنے جنوں کی
جو ایک ہی بازار سے باہر نہیں نکلے

ممکن نہیں تم جان سکو چہرے کے تیور
جذبے ہی جب اطوار سے باہر نہیں نکلے

لوگ آج بھی ہیں شاہ کی تمہید میں مصروف
لوگ آج بھی دربار سے باہر نہیں نکلے

کیا سنسنی پھیلے گی یہاں تازہ خبر سے
جب کل کے ہی اخبار سے باہر نہیں نکلے

انجم ہیں رفتار طلسم شب فرقت
ہم اب بھی شب تار سے باہر نہیں نکلے

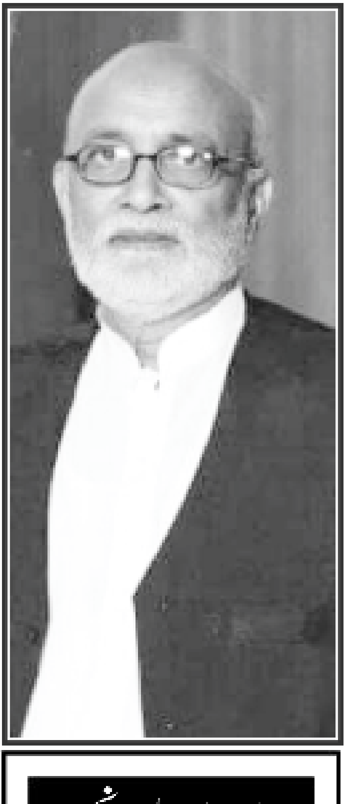

**محمد افضال انجم**

# غزل

آہوں کے شور اشک فشانی پہ غور کر
پھر ہو سکے تو نقل مکانی پہ غور کر

انگلی اٹھا رہے ہیں مسلسل مورخین
کردار کچھ نہیں ہے کہانی پہ غور کر

وحشت نے کھینچ لینا ہے تجھ کو مدار میں
کچھ روز اپنی اٹھتی جوانی پہ غور کر

پہلے تو تشنگی کے فوائد بتا انہیں
پھر میز پر پڑے ہوئے پانی پہ غور کر

لہروں کے اضطراب نے دریا کے کان میں
تنگ آ کے یہ کہا تھا روانی پہ غور کر

**اسد رضا سحر**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

سادہ کاغذ بانٹا کیسے
یوں بھی کی ہے عرضِ ہنر

# غزل

شبیر نازش

ایک تو یہ کہ خُو نہیں ہے وہ
دوسرا یہ کہ تُو نہیں ہے وہ

ہم بہم ہو کے بھی رہیں گے جدا
تجھ میں سب ہو بہو نہیں ہے وہ

پھر بھی ہر آنکھ دیکھتی ہے اُسے
گو کہ اب خوبرو نہیں ہے وہ

اب کوئی اور آرزو ہے مری
اب مری آرزو نہیں ہے وہ

ہاں مگر گفتگو اُسی کی ہے
ہاں مگر گفتگو نہیں ہے وہ

ساری دنیا کو وہ کھٹکتا ہے
صرف اپنا عدو نہیں ہے وہ

دل کا اب دل بدل چکا نازش
دل میں اب ہاؤ ہو نہیں ہے وہ

# غزل

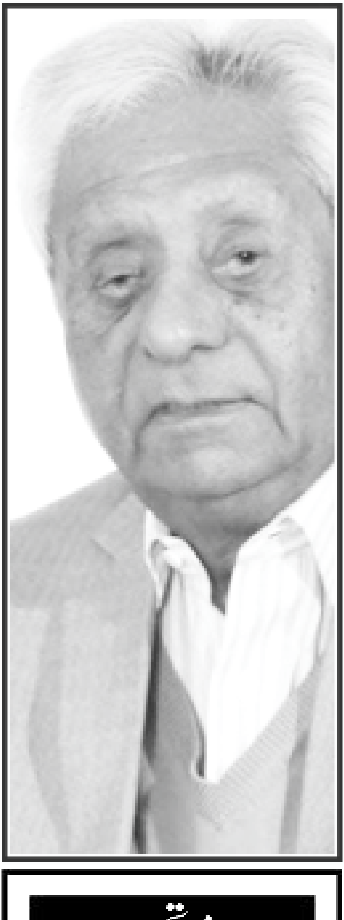

بام شب سیاہ سے تاروں کا جھانکنا سفر
شاخ شجر سے دم بدم پتوں کا ٹوٹنا سفر

شام سبک خرام سے صبح گریز پا تلک
کوشش ناتمام میں رستوں پہ بھاگنا سفر

لفظوں کی سیپ میں چھپے معنوں کا کھولنا سفر
عہد ستم شعار میں شاعر کا بولنا سفر

صوت وصدا کے جال سے نکلا ہے طائر خیال
تنہا کسی منڈیر پہ بیٹھ کے سوچنا سفر

دوش ہوا پہ مرتعش ذروں کا رقص جانگداز
دشت ستم ظریف کا ذروں کو گھورنا سفر

**فیاض تحسین**

---

------------ انتخاب ------------

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

کم نظر روتے رہے ہم نظروں کا رونا
دیکھتا کون ترے دیدہ وروں کا رونا

# غزل

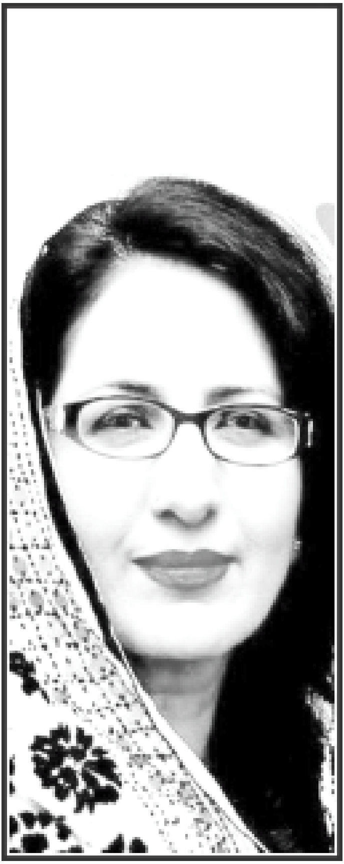

تتلی بیٹھ گئی بسکٹ پر، مکھی گر گئی چائے میں
دو گھڑیاں کیا بیٹھی میں بھی تیری یاد کے سائے میں

آج بھی سوچ کے خوش ہوتی ہوں، میری ہر اک شرارت پر
کیسا لطف تھا تیری توبہ، اف اف ہائے ہائے میں

کیسے آتی ہوگی نیند کہ جب سے تم نے ، مجھ جیسی
پتھر دل کو موم کیا اور، چھوڑا دھوپ سرائے میں

روتے روتے رخصت کرنا، دعویٰ کرنا بھولنے کا
سچ سچ کہنا کیا کہتے ہیں، اس کو تمھاری رائے میں

مجھ سے پوچھو کیا ٹوٹا ہے، کیا پھینکا کیا رکھا ہے
تم تو سیدھے آبیٹھے ہو، اک گھر سجے سجائے میں

**الماس شبی**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

سادہ کاغذ بانٹا کیسے
یوں بھی کی ہے عرضِ ہنر

# غزل

مرے ساتھ میرا خدا آج بھی
ہے کرتی حفاظت ہوا آج بھی

وہی چل رہی ہے ہوا آج بھی
بنے لوگ پھرتے خدا آج بھی

بدل گرچہ سارا زمانہ گیا
چلن اپنا سب سے جدا آج بھی

کہ دیتا رہا ماں کے جو پیٹ میں
وہی دے رہا ہے خدا آج بھی

جو تیری جدائی سے پیدا ہوا
نہ پورا ہوا وہ خلا آج بھی

نہ آئی ہمیں دنیا داری کبھی
ہے دیوار رہ میں انا آج بھی

مرا امتحاں لے تو لاکھ آزما
ترا تھا میں کل بھی ترا آج بھی

نہیں ظلم میں فرق آیا کوئی
ترے شہر میں ہے روا آج بھی

مرا دین اسلام کہتا ہے یہ
دلوں کو دکھانا گنہ آج بھی

مسلماں ہے عاصم عقیدہ ہے یہ
ہے محنت کا ملتا صلہ آج بھی

عاصم بخاری

# غزل

فکر کی سرحدوں کو سر کیجیے
خود کو دنیا میں معتبر کیجیے

کارِ دنیا کو مختصر کیجیے
دل نہیں چاہتا مگر کیجیے

ظلم کو بھی زوال لازم ہے
حاکمِ وقت کو خبر کیجیے

خود سہولت سے شان سے رہیے
اور غریبوں کو در بدر کیجیے

کب تلک آدمی سہے آخر
ظلم اک ہو تو درگزر کیجیے

اپنی شاداب زندگی کے لیے
دل کو اوروں کا چارہ گر کیجیے

غنی الرحمٰن انجم

---

-------------انتخاب-------------

- خالد احمد -

------- نعمان منظور -------

اک بے خبری مایۂ اربابِ خبر تھی
یہ بات کھلی، حیرتِ اربابِ نظر سے

# غزل

گو ستاروں بھرا آسماں اب نہیں
رات سے دل مرا بدگماں اب نہیں

دشت سے کس کو میں اپنا مہماں کروں
پہلے جیسا مرا گلستاں اب نہیں

پنچھیوں کے بنا پیڑ خاموش ہیں
جیسے گردِ رہِ کارواں اب نہیں

جس میں کردار تھے سارے چاہت بھرے
اُس محبت کی وہ داستاں اب نہیں

وقت کی تیز آندھی کچھ ایسے چلی
جو جہاں ہونا تھا وہ وہاں اب نہیں

شہر سارا ہے دلشاد بدلا ہوا
وہ مکیں اب نہیں وہ مکاں اب نہیں

محمد دلشاد رانا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

درد، انگور کی بیل تھے ، پھل گئے
غم کشوں کے لیے تلخیاں رہ گئیں

# غزلیں

پچھلی ہجرت کو بھلاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم شجر چھوڑ کے جاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم نے آباد کیے شہر تو معلوم ہوا
لوگ کیوں شہر بساتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم ترے ہجر میں لکھتے ہیں ترے نام کے گیت
اور پھر گیت سناتے ہوئے مر جاتے ہیں

دیر کر دیتا ہے آنے میں مسیحا ہر بار
ہم اُسے زخم دکھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

گھر میں رہنے نہیں دیتے یہ بدلتے موسم
"ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مر جاتے ہیں"

## کاشف افضل

## جعفر علی جعفر

اِحسان کیا طبعِ ستم گار پہ تیری
سُلگا کے جگر رکھ دیا دیوار پہ تیری

اے نازِ جہاں دیکھ سبک گام کی جانب
قربان دِل و جان ہوں رفتار پہ تیری

ہاتھوں پہ لگا خُون بھی پہچان نہ پائے
حیران ہوں میں دیدۂ بیدار پہ تیری

کچھ اشک گریں عارضِ خوش رنگ پہ تیرے
اِک آگ گرے تیغِ شرر بار پہ تیری

ٹھکرایا ہوا دِل تو بھلا چیز ہی کیا ہے
آفاق لرز جاتے ہیں گفتار پہ تیری

# غزل

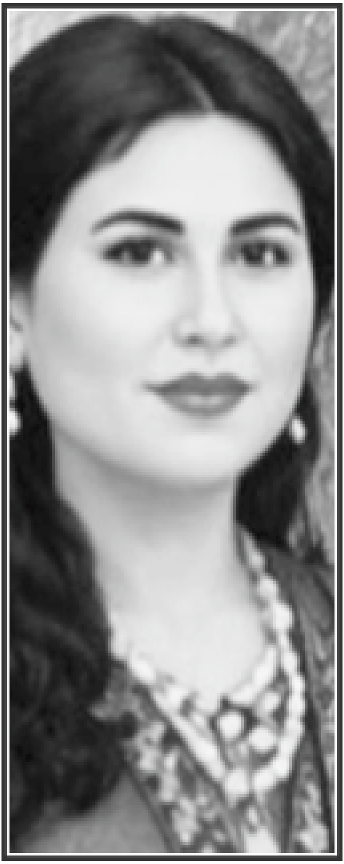

جب سے رہے نہ تیری وہ، الفت کے شب و روز
آ ہی گئے ہیں راس یہ، فرصت کے شب و روز

کر کے وہ تنہا، اب کہیں ہے دور جا بسا
اور دے گیا ہے مجھکو، فرقت کے شب و روز

بیتے دنوں کی اب نہیں ہے، آرزو کوئی
اس دل کو بھولتے نہیں، وحشت کے شب و روز

جاں پر تھے اک عذاب وہ پاؤں کے چھالے بھی
کب بھولتے ہیں ہجر، مسافت کے شب و روز

اچھے دنوں کو کیسے مگر، جائے کوئی بھول
آتے ہیں یاد گل کو، محبت کے شب و روز

**کوکی گل**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

وہ خوف تھا کہ فقط وہم تھا کہ دھوکا تھا
نہ جانے کیا اسے خود اس سے دُور رکھتا تھا

# غزلیں

محبتوں کے حوالے تلاش کرتی ہوں
سیاہ شب میں اجالے تلاش کرتی ہوں

نظر میں ان کی ترا عکس دیکھنے کے لیے
میں تیرے چاہنے والے تلاش کرتی ہوں

یہی سراغ مجھے تیرے پاس لے آیا
دکھوں کی گود میں پالے تلاش کرتی ہوں

سہارے تم بھی انوکھے ہی ڈھونڈتے ہو سدا
رفیق میں بھی نرالے تلاش کرتی ہوں

میں ماہتاب اُسے کہتی ہی نہیں ہوں کرن
جو اردگرد ہیں ہالے تلاش کرتی ہوں

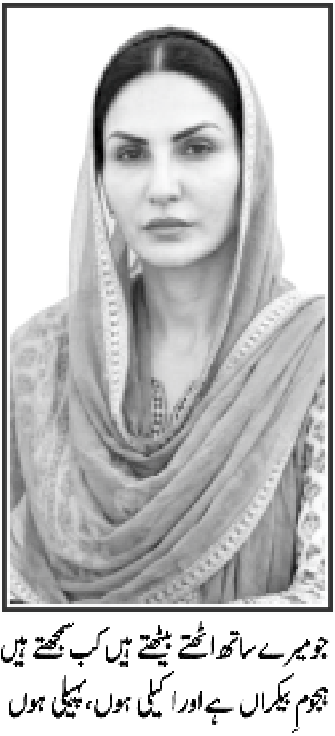

## کرن گوندل

گلاب و نسترن ہوں یا چنبیلی ہوں، پہیلی ہوں
اک الجھی سی لکیروں کی ہتھیلی ہوں، پہیلی ہوں

مرا دروازہ کھولیں گے کسی پر پگڑیوں والے
میں گاؤں کے وڈیرے کی حویلی ہوں، پہیلی ہوں

تمنا ہے کہ مجھ کو بُوجھ کر وہ جیت لے اک روز
کہا ہے کتنی بار اس سے پہیلی ہوں، پہیلی ہوں

مری آسانیوں کے دن پلٹ کر کیسے آئیں گے
میں اپنے ہاتھ میں اس طور کھیلی ہوں، پہیلی ہوں

جو میرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں کب سمجھتے ہیں
ہجومِ بیکراں ہے اور اکیلی ہوں، پہیلی ہوں

کچھ ایسا ظرف مجھ کو میرے مالک نے کرن بخشا
کوئی دشمن بھی ہے تو میں سہیلی ہوں، پہیلی ہوں

# غزل

کوئی پہلو جو احترام کا نئیں
آج سے تو بھی میرے کام کا نئیں

بس یونہی دھیان آ گیا تھا کوئی
دخل اِس میں نواحِ شام کا نئیں

ایک دُنیا کہیں چلی گئی ہے
مسئلہ صرف انہدام کا نئیں

مَیں جو پھروں کہیں نہیں جاتا
واقعہ یہ کہیں قیام کا نئیں

تیرے دَر کا ہوں جب تلک بھی ہوں
مَیں عراقی نہیں، مَیں شام کا نئیں

ڈاک خانہ بھی دیکھ آیا ہوں
ایک بھی خط تمھارے نام کا نئیں

اپنی حد میں رہیں یہ فیل و اسپ
میں تماشا کسی نظام کا نئیں

جھوٹ بولوں، زبان کا نہ رہوں
جو مرا حال ہے، تمام کا نئیں

نقشِ ثانی تو جو بھی ہو سو ہو
نقشِ اول تو میرے کام کا نئیں

آپ جیسوں سے مَیں کلام کروں!
آپ جیسوں سے مَیں سلام کا نئیں

صاحب، اس بار بھی معاف ہو
آپ کا ملک ہے، عوام کا نئیں

میں جو اپنا بھی ہو نہیں پایا
مجھ کو لاحق مرض دوام کا نئیں

چلتے چلتے بھٹک گئی تھی نظر
مسئلہ شین کاف لام کا نئیں

تیرے پہلو میں اک ذرا سی جگہ
میں اِدھر مستقل قیام کا نئیں

بس جو چاہا وہی کیا ہے نوید
حوصلہ یہ کسی غلام کا نئیں

نوید صادق

# فہیم جوزی اور "میں کوئی اور"

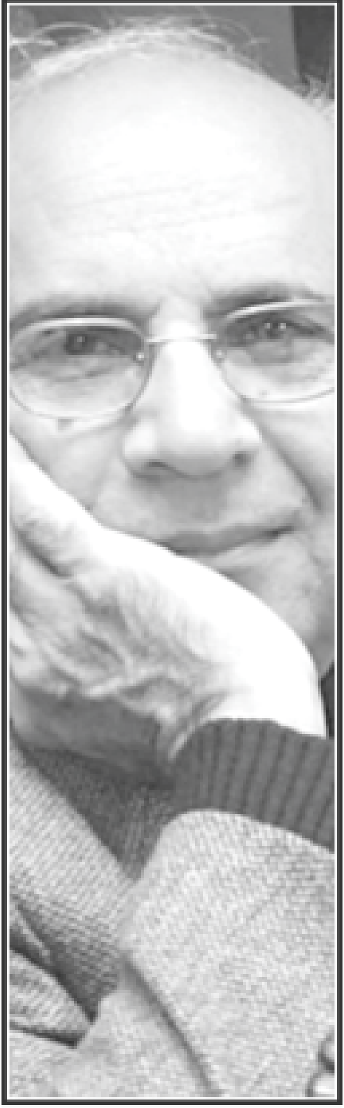

جلیل عالی

اقبال کنور فہیم جوزی سے میری شناسائی یونیورسٹی کے زمانے کی ہے۔یہ 1967 تا 1969 کا سیشن تھا۔میں نے اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان دے کر پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کے سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لے لیا تھا۔ ہم کچھ طلبہ نے یونیورسٹی میں "نئے لوگ" کے نام سے ایک ادبی وفکری حلقہ بنا رکھا تھا۔اس کے اجلاسوں میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ایسے طلبہ شریک ہوتے تھے جنھیں کچھ نہ کچھ لکھنے کا شوق تھا۔شعبۂ نفسیات سے ہارون رشید،شعبۂ معاشیات سے شاہد محمود ندیم،شعبۂ انگریزی سے سجاد میر،شعبۂ اردو ادب سے سعادت سعید، شعبۂ صحافت سے امتیاز عالم اور شعبۂ فلسفہ سے منظور اعجاز،اقبال آفاقی،محمد امین،فہیم جوزی اور شعبۂ سوشیالوجی سے خاکسار؛ شریک ہوتے تھے۔

یہیں سے ہماری دوستی کا آغاز ہوا۔فہیم جوزی کی باتیں اس کی ذہانت کو نمایاں کرتی تھیں۔ وہ طویل گفتگو کے بجائے مختصر،مربوط اور پرمغز گفتگو کیا کرتا تھا۔اس زمانے میں وہ جو نظمیں لکھتا تھا وہ ہمیں مکمل طور پر سمجھ نہیں آتی تھیں۔ مگر ان کے الفاظ اور استعارے بہت متوجہ کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ کوئی مضمون

بھی تنقید کے لیے پیش کر دیا کرتا تھا۔ اس کے ایک مضمون کا عنوان مجھے اب بھی یاد ہے۔ ''بھنگ اور آٹھواں آسماں'' دیکھیں اس عنوان ہی سے اس کی جدتِ طبع کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ نثر میں بھی اس کا ایک اپنا انداز تھا۔ ہم دونوں ان دنوں یونیورسٹی میگزین کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل تھے۔ وہ مدیرِ اعلیٰ اور میں مدیر تھا۔ اس دوران جب شعبۂ صحافت کے ایک طالب علم محمد یونس نے بطور مدیر میرا انٹرویو کیا اور وہ نوائے وقت کے آدھے صفحے پر شائع ہوا تو فہیم جوزی کو اچھا نہ لگا اور وہ مجھ سے تھوڑا ناراض بھی ہوئے۔ اس زمانے میں اس وقت کے اردو کے ایک نامور نقاد افتخار جالب اور ایک اور بجنل انقلابی دانشور عزیز الحق بھی اکثر ''نئے لوگ'' کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔ افتخار جالب ہمیں مارکسیت سے روشناس کرایا کرتے تھے۔ فہیم جوزی اور میں اشتراکیت سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوتے تھے اور بہت جونیئر ہونے کے باوجود بعض زاویوں سے افتخار جالب سے اختلاف کی جسارت بھی کر جایا کرتے تھے۔ فلسفے کے باقاعدہ طالب علم ہونے کے باوجود فہیم جوزی اپنی گفتگو میں فلسفیانہ معلومات کا رعب نہیں جمایا کرتا تھا۔ بڑے بڑے فلسفیوں کے خیالات ٹھونسنے کے بجائے اپنی اور بجنل بات کرتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے ذہن پر دوسروں کے افکار سوار نہیں ہونے دیتا تھا۔ مفکرین کے تصورات کی جگالی نہیں کرتا تھا، اخذ و اکتساب سے اپنا اندازِ نظر بنانے کی کوشش کرتا تھا۔

جوزی آزاد نظم اور نثری نظم دونوں میں شاعری کرتا ہے۔ اس کی نظم خود بتاتی ہے کہ وہ اپنے لیے مخصوص ہیئت کیوں بروئے کار لائی ہے۔ وہ سادہ گو نہیں ہے۔ اس کی نظمیں تہہ دار اور پیچیدہ ہوتی ہیں۔ مگر یہ پیچیدگی لسانی پیچیدگی نہیں ہے، خیال کی پیچیدگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا شعری متن ذرا زیادہ سنجیدہ توجہ کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ نظری طور پر بھی مکمل عدم ابلاغ کے خلاف ہے۔ اس کے موضوعات بیشتر فکری ہوتے ہیں مگر ان میں یکسانیت نہیں ہوتی، تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں بھی کہا کرتا تھا کہ ادب کو انسانی صورت احوال بننا چاہیے۔ گویا وہ ادب میں انسانیاتی سروکار کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اس کی نظموں میں جگہ جگہ ایسے مقامات آتے ہیں جہاں صورتِ واقعہ کے اچنبھائے جانے کا بھرپور اور حیرت افزا احساس ابھرتا ہے۔ ایسے مقامات پر اس کے فکر و اسلوب کی جودت اپنے عروج پر ہوتی ہے اور قاری کو ایک تسلسلِ ابلاغ کی رو کے سپرد کر دیتی ہے۔ اس کی نظمیں

کفایتِ لفظی کا عمدہ نمونہ ہوتی ہیں۔ ان میں غیر ضروری سطریں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ وہ نظم کو ایک نامیاتی وحدت بنانے کا ہنر جانتا ہے۔ ایسے تہہ دار اور لطیف و عمیق شاعر کے قارئین کا حلقہ بھی نکتہ شناس اور زیرک اصحابِ ذوق پر مشتمل ہوتا ہے، جو بے شک تعداد میں کم ہوتے ہیں مگر ادبی و تہذیبی دنیا کا بہت قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ اس کے مجموعۂ نظم ''میں کوئی اور'' سے اس کے فکر و فن کے منفرد اظہار کی نمائندگی کرتی ہوئی خوبصورت نظموں کے چند اقتباس ملاحظہ فرمانے سے پہلے یہ یاد رہے کہ فہیم جوزی نے آزاد نظموں اور نثری نظموں کے الگ الگ گوشے نہیں بنائے۔ دو چار نثری نظموں کے بعد اچانک ایک آزاد نظم آجاتی ہے اور اس کی بھی دو چار سطریں پڑھنے کے بعد جب قاری پر اس کا عروضی آہنگ منکشف ہوتا ہے تو خوشگوار حیرت کے ساتھ پوری نظم دوبارہ پڑھنی پڑتی ہے۔ یوں اس کے کئی خوابیدہ گوشے بیدار ہونے لگتے ہیں۔ کچھ نظموں کے مختصر پارچے پیشِ خدمت ہیں۔

کومل رومانوی جذبہ و احساس کو ایک تہذیبی شائستگی سے گدگداتی ہوئی نظم:

ہم نے اک ایسا خواب دیکھ لیا تھا
جو نگاہوں سے نگاہوں تک پھیل گیا تھا
ہم نے ایک ایسا دیپ جلا دیا تھا
جس کی روشنی ہونے سے ہونے تک تھی
ہم نے ایک ایسی کسک جگا دی تھی
جو مہک سے مہک تک تھی

(ہم نے)

یہ نکتہ نمایاں کرتی ہوئی نظم کہ انسان ارتقاع کے جتنے مراحل بھی طے کر جائے اس کی باطنی سفلیت مکمل ختم نہیں ہو پاتی۔

نیلا آسمان میری شکتی ہے
میں تیرے چہرے کی دھوپ ہوں
اور پانیوں میں تیرا عکس ڈھونڈتا ہوں
تیرے بالوں کی ایک لٹ
کہہ بھی چکی وہ بات
جو زاویہ ہے میرے سانسوں کا
اور زمانوں کا
سات دریاؤں کے پانیوں سے دھلی میری روح
پھر بھی رہی گدلی

(نیلا آسمان)

حقیقتِ مطلقہ اور حسنِ تام کی ایک جھلک دیکھ لینے کے لمحوں کی سرشاری سے شرابور نظم

میں نے اسے دیکھا ہے
اس لمحے جب سلفر سے شفا پھوٹتی ہے
آہن سے چنگاری چھوٹتی ہے
جب خوشبوان دیکھے کناروں پر تیرتی ہے
سیاہی پر تنگ ناچتی ہے

(طلوع)

دوستوں سے تخاطب کے پیرائے میں پوری

انسانیت سے کومٹمنٹ کا بیان بنتی ہوئی مختصر نظم:
مرے جسم کے گوشت کو ریزے ریزے میں
تقسیم کر دو
پھر ان سے لہو کی اک اک بوند تقطیر کر لو
چراغوں میں بھر لو
پھر ان کی لووں میں
مری داستاں کو پڑھو
ہنسو
مسکراؤ
مرے دوستو میں نے صبحِ ازل یہ قسم کھائی تھی
میں تمھارا رہوں گا
(قسم)

یومِ آزادی کے حوالے سے لکھی ہوئی نظم جو فہیم جوزی کے گلے میں سچی، کھری اور گہری وطن دوستی کے چمکتے ہوئے لاکٹ کی طرح لہراتی دکھائی دیتی ہے۔
پھولوں کی دھرتی پہ کھلنے والا دن
یہ مقدس دن!
لہو کے ان سچے رشتوں پر چلتا آیا ہے، جن سے
خوابوں کی لڑیاں جڑی ہوئی ہیں!
جو کچھ ان سچے رشتوں نے سوچا
اور آنے والے دنوں کی جو تصویریں دیکھیں:
سچی اور انمول اور سجری
جن کی سب تصدیقیں
آج کے اس دن کا آئینہ ہیں!
آؤ دیکھیں اپنے اپنے چہرے اس آئینے میں!
اور اپنی اپنی شناخت کریں،
اور اپنا اپنا روپ۔ اجالائیں
دن نکلا ہے
کیسا دن ہے
اچھا دن ہے!
سچا دن ہے!
(اک یہ دن)

ایک ایسے کردار کے خد و خال اجاگر کرتی ہوئی نظم جو رفاقت سے گریز کرتا ہے، ترحم اور ہمدردی کے رویوں کو جھٹکتا ہے، محبت سے بھاگتا ہے اور پوری زندگی کسی سے کسی طرح کا تعلق استوار نے سے اجتناب کرتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگی کا اختتام ہو جاتا ہے۔
جب کوئی اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتا
وہ راستہ بدل جاتا
جب کوئی اس کے دل کا کانٹا نکالنے کی کوشش کرتا
وہ راستہ بدل جاتا
جب کوئی چوڑی اس کے لیے کھنکتی
وہ راستہ بدل جاتا
وہ راستے بدلتا گیا، بدلتا گیا، بدلتا گیا
لیکن ایک روز اس کا دل خاموش ہو گیا
سناٹے کی چادر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا
اور وہ غائب ہو گیا
دھرتی کا آخری کنارہ آ گیا تھا
(آخری کنارہ)

سا تجھے دکھوں کا رونا روتی نظم۔ جو یہ کہتی ہے
کہ آؤ بادلوں کی طرح روئیں کہ یہ دکھ کھل کر
بادلوں کی رونے سے ہی کم ہوگا۔ کہ تنہا تنہا
رونے سے بات بہت آگے نکل گئی ہے کہ
بادل رہتے ہیں تو روئیدگی کو جنم دیتے
ہیں۔ اس نظم میں شاعر رفیقوں اور ہم نظروں
سے مشارکت کے احساس کے ساتھ
مشترک دکھوں کے آنسو کھل کر رویا ہے۔
اس میں ان سب اجتماعی بدحالیوں کا دکھ
موجود ہے جو ہمارے حالات کی دین ہیں یا
خود ہمارے اپنے کرتوتوں کا خمیازہ ہیں۔
زندگی کے مختلف شعبوں اور دائروں کی
دلدوز تصویریں دکھاتی یہ نظم اپنی گہرائی اور
گیرائی کی بنا پر ایک شہر آشوب سے آگے
ایک تہذیب آشوب بن گئی ہے۔
مجھے لحن بخشا گیا کہ بولوں وہ کہ جو بولنا
نہیں ہے
سماعت بخشی گئی کہ سنوں وہ کہ جو سننا نہیں ہے
لحن و سماعت کی دریوزہ گری میں سانس
سانس دفن ہو جاؤں
کچھ ایسے گڑگڑاؤں کہ آواز مرے تالو سے
پھسل پھسل جائے
کرشن بجا لاؤ
اہلِ دربار خبردار نگاہیں نیچی
مجاوری نسلوں کی سیڑھیاں چڑھتی ہے
زمین کی شریانوں میں بانجھ رطوبت پھیلاتی

علم، حسن اور یقین پر کا ایمانیات کی
چلم الٹاتی
دودھوں جلی حرام زادہ کو ڈرائی کلین کر کے
ٹیوٹا میں لٹکایا
تو شریف زادیوں کی نگاہیں حیا سے جھک گئیں
(آؤ بادلوں کی طرح روئیں)
داستانوی پیرائے میں لکھی گئی، لازوال عشق
کو اسمِ اعظم بناتی ہوئی ارتفاعی جہت میں
بہت اوپر اٹھ جانے کے احساس سے آشنا
کرتی نظم:
قافلے گذرتے
اور اس درخت کے تنے میں ایک زخم لگاتے
جہاں سے دودھ بہتا
اور وہ اپنی پیاس بجھاتے
ایک دن اس کی محبوبہ کا قافلہ بھی
وہیں سے گزرا
اس نے بھی ایک کاری زخم لگایا
تو لہو کی ایک دھار نے اسے رنگین کر دیا
اور شاخوں سے دو موتی گرے
جو اس کے بالوں میں الجھ گئے!
(امرجیون)
اس مجموعے کی نظمیں پڑھتے ہوئے ان کی
تشبیہوں، استعاروں، نادر تمثالوں اور حیرت
افزا علامتوں میں ہر جگہ فہیم جوزی کی مانوس
موجودگی اپنا بھرپور احساس ابھارتی ہے۔
☆☆☆☆☆

# ولی دکنی کے ہم تخلص کلاسیکی شعرا اور اُن کی تخلیقات

خاور اعجاز

اردو ادب کی تاریخ میں ایک نام یا تخلص کے متعدد شعرا کا تذکرہ ملتا ہے لہٰذا ولی کا نام یا تخلص بھی کوئی استثنا نہیں۔ یہ سلسلہ ولی دکنی سے قبل شروع ہو کر عہد حاضر تک جاری و ساری ہے جس کا اجمالی جائزہ آئندہ سطور میں پیش کیا جائے گا:

منشی ولی رام ولی (متوفی ۱۶۶۶ء)

شاہزادہ دارالشکوہ کے علم دوست، صوفیانہ اور ادبی مزاج کے باعث بہت سے ہندو مسلم لکھاری اُس سے وابستہ رہے جن میں ایک ہندو کایستھ گھرانہ کے فرد منشی ولی رام ولی (اصل نام بنوالی داس) بھی شامل ہیں۔ کم عمری سے ہی مزاج متصوفانہ تھا۔ اسی شوق نے انھیں کشمیر کے ایک معروف روحانی پیشوا ملا شاہ بدخشی (متوفی ۱۶۶۱ء) کے ہاتھ پر بیعت کرائی جو وحدت الوجود کے نظریہ پر مبنی مابعد الطبیعاتی افکار کے حامل تھے۔ دارالشکوہ (متوفی ۱۶۵۹ء) اور اُس کی ہمشیرہ جہاں آرا (متوفی ۱۶۸۱ء) بھی ملا موصوف کے پیروکاروں میں شامل تھے۔ ولی رام دارالشکوہ کے مشیر خاص رہے مگر اُس کی وفات کے بعد دنیا سے کنارہ کشی

اختیار کی۔ ولی رام سترہویں صدی عیسوی کے ممتاز عربی، فارسی اور ہندی دانشور تھے اور اُن ہندو شعراٗ میں شامل تھے جنھوں نے فارسی کے ساتھ ہندی اور اپنے زمانے کی اردو زبان میں بھی شاعری کی تاہم کلام میں فارسی کا غلبہ رہا۔ وہ ہندو فلسفہ کے ساتھ اسلامی تصوف پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اُردو زبان کی ابتدائی نشوونما میں اُن کا بڑا حصہ ہے۔ اُن کی اُردو منظومات اس امر کی دلیل ہیں کہ وہ اُردو کے قدیم ترین محسنوں میں سے ایک ہیں۔ داراشکوہ ہی کی ایما پر اُنھوں نے سنسکرت کی متعدد قدیم فلسفیانہ اور مذہبی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا جن میں کرشن مشرا کا مشہور ڈرامہ ”پربودھ چندرودیہ“ بھی شامل ہے۔ ترجمہ کے بعد ڈرامہ کا نام ”گلزارِ خیال“ رکھا گیا جس نے ہندو مسلم فکری دائرے کو قریب لانے اور جلا بخشنے میں رول ادا کیا۔ ڈرامے کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے کردار انسان نہیں بلکہ انسانی صفات ہیں جیسے عقل، جہالت، ایمان وغیرہ۔ اصل ڈرامہ گیارھویں صدی عیسوی کی تحریر ہے جسے ولی رام نے ۱۶۶۲ء میں فارسی نظم ونثر کے امتزاج کے ساتھ پیش کیا۔ فکری سطح پر اس میں ہندو فلسفیانہ خیالات کو اسلامی تصوف کے نظریۂ وحدت الوجود کے ساتھ جوڑ کر ایک نیا فکری زاویہ بنانے کی سعی کی گئی ہے جو دونوں مذاہب کے مشترکہ اصولوں کو سمجھنے میں معاونت کرتا ہے۔ اپنے منفرد اسلوب کی بنا پر ولی رام کی یہ کاوش مغل دور کے علمی حلقوں میں بہت مقبول ہُوئی اور بڑے پیمانے پر زیرِ مطالعہ رہی تاہم گمان کیا جاتا ہے کہ اصل سنسکرت متن تک رسائی کے لیے مترجم نے شاعر نند داس کے برج بھاشا والے نسخہ سے بھی استفادہ کیا ہوگا۔

یہ تمثیلی ڈرامہ وشنومت کی عقیدت پر مبنی فلسفیانہ خیالات کو اُجاگر کرتا ہے اور بہت عرصہ تک مختلف لکھنے والے اس کی کہانی سے متاثر ہو کر اپنی تحریریں تخلیق کرتے رہے۔ ۱۵۷۰ء کے اردگرد شاعر نند داس (۱۵۳۰ء۔۱۵۸۵ء) نے اس ناٹک کو برج بھاشا میں پیش کیا۔ کہانی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ برِصغیر کے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز بھی اس کا ایک نسخہ حاصل کرنے والوں میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرقی مخطوطات کے ذخائر جمع کرنے والے ولیم جانسن (متوفی

۱۸۰۷ء) کے پاس بھی ایک نسخہ موجود تھا۔ اسی فہرست میں گلزارِ حال کے دو نسخے رکھنے والے برطانوی جمع کنندہ ڈی ڈکسن کا نام نامی بھی آتا ہے۔ پیرس میں موجود ایک نسخہ کرنل جوزف جینٹل (متوفی ۱۷۹۹ء) نے نواب شجاع الدولہ (متوفی ۱۷۷۵ء) کے مشیر اور مذاکرات کار کی حیثیت سے برِ صغیر میں اپنے قیام کے دوران حاصل کیا۔

ولی رام کی شاعری بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اُن کی غزل میں شیخ جمالی کنبوہ اور حاجی بہرام سقا کی طرز کے جڑے ہُوئے الفاظ حاوی نظر آتے ہیں:

چہ دِل داری دریں دُنیا کہ دُنیا سے چلانا ہے
چہ دِل بندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جانا ہے

بہ ہنگامِ اجل آید بکارت کُکھ نہ لکھ آید
بچھائی کاہ کی تیری وہی تیرا بچھانا ہے

شرابِ سُرخ می نوشی، اجل کردی فراموشی
مرن کو دُور مت سمجھو عجب یہ ٹک بہانا ہے

..............................

ولی دکنی کے دور میں خود اُن کے علاوہ بعض حضرات ایسے تھے جن کے نام یا تخلص ولی تھے۔ مثلاً حاجی ولی، شاہ ولی اللہ سرہندی، ولی ویلوری اور ولی بیجاپوری۔

حاجی ولی عہدِ عالمگیر (۱۶۵۸ء - ۱۷۰۷ء) میں شاعری شروع کی۔ اپنے زمانے کی بول چال کو ذہانت سے جزوِ کلام بنایا۔

خط کے آنے نے خبردار کیا گلرو کو
نشۂ ہوش ہے اِس بادۂ ریحانی میں

..............................

اثرِ بادۂ جوانی ہے
کر گیا ہُوں سوال کچھ کا کچھ

..............................

ولی ویلوری (۱۷۴۹ء تک حیات) نام سید محمد فیاض تھا۔ ابتداً فوج میں ملازمت کی۔ نوجوانی کے دن ویلور سے چالیس میل کے فاصلہ پر واقع "سات گڈھ" کے صوبہ دار امیر حراست خان کی رفاقت میں گزارے پھر کڈپہ ہجرت کی اور یہاں کے صوبہ دار نواب عبدالمجید خاں نے آپ کو برسرِ روزگار کر دیا۔ اس کا ذکر انھوں نے مثنوی "رتن پدم" کے دیباچہ میں یوں کیا ہے:

حراست خاں امیر ایک نامور تھا
سکونت گاہ اس کوں سات گڈھ تھا

..............................

انا اور اہلِ درد و نیک اعمال
رفاقت میں اتھائیں اُس کے خوش حال

..............................

تجارا واں سوں ہو قسمت نے برخاست
سو آیا میں طرف کڈپہ کے دھر خواست

..............................

نواب عبدالمجید ابن الحمید ایک
اتھا واں نام ور صوبہ سعید ایک

..............................

ولی ویلوری صوبہ تمل ناڈو کے اہم تاریخی شہر ویلور میں شعری و ادبی تاریخ کا نقطۂ آغاز اور اپنے عہد کے باکمال، پُرگو اور کہنہ مشق شعرا میں تصور کیے جاتے ہیں۔ مذہب اور تصوف کے رنگ میں متعدد مثنویات اپنی یادگار چھوڑیں جن میں ۱۷۱۳ء اور ۱۷۱۷ء کے درمیان لکھی گئی مثنوی "رتن پدم" کو اُن کی اوّلین کاوش قرار دیا گیا ہے جو تقریباً ۴۰۰۰ شعروں پر مشتمل ہے اور سرندیپ کی مہارانی پدماوتی اور چتوڑ کے راجہ رتن سین کی داستان ہے۔ یہ دراصل ملک محمد جائسی کی اودھی زبان میں لکھی گئی "پدماوت" کا منظوم ترجمہ ہے۔ ولی ویلوری نے یہ کتاب آندھرا پردیش کے نواب عبدالمجید کی فرمائش یا اس کے دربار سے وابستگی کے صلہ میں لکھی۔ نواب صاحب نے شاعر موصوف کی بہت قدر و منزلت کی۔ یہ ایک ضخیم عشقیہ اور رزمیہ مثنوی ہے جس میں مہم جوئی اور مافوق الفطرت عناصر بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ تمل ناڈو سمیت جنوبی برصغیر کے مختلف مقامات، ثقافت اور ماحول کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ مثنوی کے صوفیانہ رموز میں راجہ روح، پدماوتی عشقِ حقیقی اور طوطا مرشد کی علامتوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔

تصوف کے موضوع پر اُن کی ۵۵۰۰ شعروں اور دس مجالس پر دوسری تالیف "روضۃ الشہدا" ہے جس نے شہرت حاصل کی۔ آغاز حضورؐ کی وفات سے ہوتا ہے۔ مجلس دوم حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بارے میں ہے۔

ولی توں بولنا صلوٰۃ ہر دم
یہاں کر نامہ دوم کوں ختم

..............................

مجلس دہم میں حضرت سہل بن سعدؓ (۶۱۴ء-۷۱۰ء) کے بارے میں ۲۶ شعر ہیں۔ یہ آخری مدنی صحابی تھے اور کم عمر صحابہ میں بلند مقام کے حامل تھے۔ پہلا نام حزن تھا جسے حضورؐ نے بدل کر سہل رکھا تھا۔ غزوۂ احد میں شہر کی حفاظت کی اور غزوۂ خندق میں مٹی ڈھوئی۔ حضورؐ کے منبر کے لیے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائے۔ واقعہ غدیر نیز کربلا اور بعد کے واقعات کے راوی ہیں۔

بنیادی طور پر یہ مثنوی سبزوار (ہرات) کے ساکن کمال الدین حسین واعظ کاشفی (متوفی ۱۵۱۴ء) کی تصنیف ہے جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور کربلا کے مصائب کے سلسلے میں لکھی۔ کتاب دس ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے جس میں آئمہ کرام کے مختصر حالات زندگی نیز انبیا عظام کی مصیبتیں اور قریش کی جانب سے رسول اللہ پر کیے گئے مظالم کو بحث کا ابتدائی حصہ بنایا گیا ہے تاہم اصل ہدف مصائبِ امام حسینؓ ہی ہے۔ واعظ کی تصنیف کو ۱۷۲۳ء میں حسینی دکنی اور ۱۷۳۴ء میں ولی ویلوری نے ترجمہ کیا جب کہ ولی دکنی نے اپنی تصنیف کا نام ''دہ مجلس'' رکھا۔ مثنوی کا موضوع خاندانِ رسول کی جنگیں اور شہادتیں ہے تاہم شاعرانہ نکات اور دیگر شعری محاسن سے آراستہ یہ مثنوی محض مذہبی تصنیف محسوس نہیں ہوتی۔

''روضۃ الشہدا'' کے علاوہ اُن کی ۲۲۴۰ شعروں پر محیط ''روضۃ الانوار''، ۱۳۵۰ شعروں پر مشتمل ''روضۃ العقبیٰ'' بھی عمدہ مثنویاں ہیں جو شریعت اور طریقت کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان کا زمانۂ تصنیف ۱۷۱۷ء تا ۱۷۲۸ء بتایا جاتا ہے۔ مزید برآں ''دعائے فاطمہ'' اور ''وفات نامہ'' بھی انھی کی تصانیف ہیں۔

''روضۃ الانوار'' ۸ مئی ۱۷۴۶ء کو مکمل ہوئی۔ ۲۲۴۰ شعروں پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی نورِ نبی، ولادتِ رسول، سفرِ شام، اولاد و امہات المومنین، ابتدائے وحی، ہجرتِ مدینہ، واقعہ معراج، معجزاتِ نبوی اور حج الوداع جیسے موضوعات پر مبنی ہے جبکہ اشخاص میں حضرت امیر حمزہؓ، حضرت عمرؓ خطاب، بی بی خدیجہؓ، بی بی ام حبیبہؓ، حضرت عبداللہ، حضرت ابو طالب اور غزوات و فتوحات میں بدر، احد، احزاب، تبوک، خیبر، مکہ، حنین اور طائف کا تذکرہ ہے۔

وداع کر ایک اِک خویشاں وہاں کے
مدینہ پھر چلے مرسل جہاں کے

---

درودواں ہیں ہزاراں لک دما دم
بر آں سر دفترِ ایجادِ عالم

---

''روضۃ العقبیٰ'' نومبر ۱۷۴۹ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ تصنیف ۱۳۵۰ شعروں پر مشتمل احوالِ آخرت پر مبنی ہے۔ فہرستِ مضامین یوں ہے: حمد، نعت، مناقب، موت، قبر،

قیامت، امام مہدیؑ، دجال، خروج یاجوج ماجوج، عیسیٰؑ، قیامِ حشر، امتیاز مومناں و کافراں، دوزخ، پُل صراط، شفاعتِ انبیا کرام وغیرہ۔

ہماری امتاں کی کت شفاعت
محمد تب منگیں حق سوں اجازت

..............................

ان کے علاوہ نومبر ۱۶۹۳ء میں ضبطِ تحریر میں آنے والی ۱۰۵ شعروں کی مثنوی ''پند نامہ'' اور ارکینِ نماز سے متعلق ۳۰۰ شعروں کی مثنوی ''اساس المصلی'' پر بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ ولی ویلوری ہی کی ہیں۔ انتقال کے بعد آرکاٹ کے محلّہ اسد پورہ میں مدفون ہُوئے۔

ولی بیجاپوری کی شہرت کا سبب ان کی مثنوی ''تنبیہ نامہ'' ہے جو ۱۷۳۷ء کی تصنیف ہے اور عادل شاہی دور میں لکھی گئی۔ اس میں مذہبی، اخلاقی اور تصوف کے موضوعات پر قلم اُٹھایا گیا ہے۔ عربی، فارسی کے ساتھ مقامی ہندوی زبان اور دکنی لب و لہجہ کہ جھلک اس مثنوی کا خاصا ہے:

یہ تنبیہ نامہ کیا جب تمام
نبی کے اسم سے کیا اختتام

..............................

الٰہی ولی کے تئیں بخش اب
کر اُس کے گناہوں کو ناچیز سب

..............................

ولی دکنی کے بعد بھی اس تخلص کے متعدد شاعر ہُوئے جن کا عہدوار ذکر ذیل کی سطور میں درج کیا جاتا ہے:

ولی اللہ ولی سورتی (معاصر انعام اللہ یقین ۱۷۲۷ء-۱۷۵۵ء) مہذب اور بااخلاق شاعر تھے۔

کیا ظلم ہے اے سوئی سی پلکوں والے
آہستہ سیو زخم ہیں دل کے آلے

ترچھی وہ نظر گذر گئی سینے سے
ورنہ تیزے بہت ہیں دیکھے بھالے

..............................

ولی اللہ ولی سندیلوی ۱۷۷۳ء سے قبل موجود تھے۔ شور انگیز طبع اور مجنوں وضع شخص تھے۔

جاتے ہیں جس طرف کو لوگ اُن کو گھورتیں ہیں
دیکھو یہ دونوں بھائی کیا خوبصورتیں ہیں

..............................

میرزا ولی محمد ولی دہلوی (۱۷۸۰ء تک مرشد آباد میں حیات) ولی نژاد تھے لیکن مرشد آباد میں قیام پذیر رہے۔ ریختہ کا ایک دیوان موجود تھا۔

چاہے کیوں کر کہ یہ جی تن سے نکل جانے کو
پھر نہ آیا جو گیا اُس کی خبر لانے کو

.............................

بندِ قبا چمن میں جو وہ یار وا کرے
لے برگِ گل کو ہاتھ میں پنکھا صبا کرے

.............................

مرزا احمد ولی جتلا لکھنوی (۱۷۲۷ء - ۱۷۸۶ء) کے دوست تھے۔

مرزا محمد علی ولی شاگرد مرزا قدوی (۱۷۲۷ء- ۱۷۹۶ء)- بنگالہ میں نشو و نما پائی۔

خوش آئے کب گلوں کا تبسم ہزار کو
دیکھے جو مسکرانے میں وہ لعلِ یار کو

.............................

شیخ ولی محمد ولی دہلوی (پ ۱۸۱۵ء) باشندہ سیالکوٹ- شاگرد نصیر دہلوی- نواب بہادر جنگ والیِ بہادر گڑھ کے رفیق و مصاحب تھے۔

رتبہ تھا کیا قمر کا کہ کرتا وہ ہمسری
جب آفتاب رُخ کے برابر نہ ہو سکا

.............................

کیونکہ جتلاؤں نشاں تجھ کو ستمگر اپنا
عالمِ خانہ بدوشی میں کہاں گھر اپنا

.............................

سید ولی محمد ولی غازی پوری شاگرد مرزا عنایت علی بسمل- پیشہ وکالت-

عاشقوں میں کسے دیدِ رُخ انور ہو نصیب
بخت کا کس کے چمکتا ہے ستارا دیکھیں

.............................

نواب ولی محمد خاں ولی لغاری (۱۸۳۶ء- ۱۹۱۴ء) تعلق تاج پور (ضلع سانگھڑ) سے تھا- تالپور دورِ حکومت میں سندھ کے وزیرِ اعظم اور سپہ سالار رہے- انگریزوں کے قبضۂ سندھ (۱۸۴۳ء) کے وقت پنجاب چلے گئے جہاں سے ۱۸۴۷ء میں واپسی پر تعلقہ سکرنڈ میں اپنی جاگیر مرزاں پور میں رہائش اختیار کی- فارسی کی تعلیم کے ساتھ کچھ عربی بھی پڑھی - صوفی ابراہیم شاہ کی صحبت میں تصوف اور فقیری اختیار کی - صوم و صلوٰۃ اور ریاضت و عبادت میں وقت گزارتے- موسیقی سے دلچسپی تھی اور اُس زمانے کا سب سے مقبول ساز یعنی ستار بجاتے تھے-

جوانی میں شاعری کا شوق ہوا - صوفی شاعر تھے اور سندھ کے بااثر اشخاص میں شمار ہوتے تھے- ہندی کے علاوہ سندھی، سرائیکی اور فارسی میں بھی شاعری کی جس میں عشقِ حقیقی اور توحید جیسے صوفیانہ رنگ کی آمیزش ہے- دوہے اور کافیاں بھی لکھیں - غزل بھی کافی نما ہی کہتے تھے- ''واعظ العشاق'' کے نام سے شعری مجموعہ ہے-

اسی منزل میں ہر عاشق، گہے پُر جوش گہ سالک
گہے وہ عبد گہ مالک ، گہے سربارِ ہستی کا

دل محو ہو گیا ہے محبوب کے حُسن میں
مشتاق ہوں اسی کا بلبل مثل چمن میں

..............................

خُدا بن حال میرے کا نہیں کو دُوسرا واقف
کہ ساری رین میں مجھ کو ستاروں کا شمارا ہے

..............................

مولوی امو جان ولی دہلوی (پ ۱۸۴۷ء؟) شاگردِ غالب - جدِ امجد مغلوں کے اتالیق کے طور پر بخارا سے برِ صغیر وارد ہُوئے اور مدرسی کا پیشہ نسل در نسل چلتا ہُوا امو جان تک بھی پہنچا جن کا بچپن دِلّی اور اس کے قرب و جوار میں گزرا اور دِلّی اسکول میں فارسی کے مدرس رہے۔ بعد ازاں فیروز پور کے ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہُوئے۔ اکثر پانی پت جاتے اور اپنے مرشد غوث علی شاہ پانی پتی کی خدمت میں حاضری دیتے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔

غزلوں کے علاوہ رباعی ان کا خاص میدان تھا۔ مذہبی رنگ کی رباعیات پر مشتمل رباعیات کا مجموعہ ''عجائباتِ امو جان'' کے نام سے موجود ہے۔

پردہ جبھی تلک ہے کہ پردے میں ہے وہ شوخ
چہرہ کُھلا تو راز چھپایا نہ جائے گا

محشر میں رُوبرو مرے آ کر کھڑا ہُوا
جانا کہ اس سے شور مچایا نہ جائے گا

غم بے ستوں نہیں ہے کہ آگے سے ٹال دُوں
سینے کا سنگ ہے یہ ہٹایا نہ جائے گا

..............................

علی محمد خاں ولی لکھنوی شاگرد نواب ظفر یاب خاں راسخ (م ۱۸۵۷ء)۔ صاحبِ دیوان تھے۔

تابعِ فرمان ہیں جو چاہیے وہ کیجیے
تازِ بے جا آپکے اے مہرباں بالائے سر

..............................

اندوہ و یاس و درد و غم و دُوریِ صنم
کیا کیا میسر آئے ہمیں آشنائے دل

شکوہ نہیں ہے کچھ فلکِ پیر سے ہمیں
دشمن نہیں ہے کوئی ہمارا سوائے دل

..............................

دلا یہ حال ہے اَب کے خدا پرستوں کا
جو دل ہیدیر کی جانب تو قبلہ رُو آنکھیں

..............................

ثابت ہُوا یہ ہم کو رہِ عشق سے ولے
پائیں گے حشر تک نہ ہمارے فراغ پاؤں

☆☆☆☆☆

# عمران تنہا کے نعتیہ مجموعے "لا تقولوا راعنا" پر ایک نظر

کاموکی کے زرخیز نعتیہ خطے سے نوجوان نعت گو شاعر عمران تنہا کی کتاب اپنے انوکھے اور اچھوتے عنوان ''لا تقولوا راعنا'' کے ساتھ موصول ہوئی تو خوشی کے ساتھ ساتھ بہت سی کہانیاں یاد آگئیں۔ اردو اور پنجابی نعتیہ شاعری کے حوالے سے کاموکی اسی طریقے سے شہرِ نعت کہلاتا ہے جیسے فیصل آباد یا راولپنڈی۔ اسی شہرِ نعت سے بڑی بڑی ادبی ہستیاں دوسرے شہروں میں جہاں جہاں بھی گئیں، وہاں انھوں نے اپنے اپنے تقدیسی نقوش ثبت کیے۔ اس لیے مجھے کاموکی شہر سے ایک خاص نسبت اور محبت ہے۔ یہاں کے نامور شعرا میں جہاں جناب حنیف نازش قادری (مرحوم) اور حافظ عبدالغفار واجد کا نام لینا ضروری ہے، وہاں اب عمران تنہا کی کتاب پڑھ کر محسوس ہوا کہ یہ ایک تقدیسی اور تخلیقی زرخیزی کا تسلسل ہے جو پرانی نسل سے عمران تنہا جیسی نئی نسل میں منتقل ہو رہا ہے۔ یوں گویا کاموکی کی زرخیز کھاد نہ صرف دوسرے باغاتِ نعت میں بھی تقدیسی گلستان مہکا رہی ہے، بل کہ خود کاموکی میں بھی ایک تقدیسی خوشبو بانٹ رہی ہے۔ جناب حنیف نازش قادری صاحب سے، میرا بڑا دیرینہ تعلق رہا۔ راولپنڈی اسلام آباد کی محافلِ نعت میں بھی ان کا فیض حاصل ہوتا رہا، پھر ان کی علالت کے دوران بھی ان کے پاس حاضر ہوتا رہا اور اس حالت میں بھی ان کا کلام عطا ہوتا رہا، یوں جانیے کہ ان سے نعت گوئی کی نسبت سے بہت کچھ سیکھا۔ کچھ لفظوں پر انھوں نے اصلاح بھی دی، انھوں نے خاص طور پر میری ایک نعت کے ایک لفظ کی جو اصلاح کی، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں نے ایک لفظ کو ''جَید'' باندھا تھا، انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ ''جیِّد'' ہے۔ چنانچہ میں اس

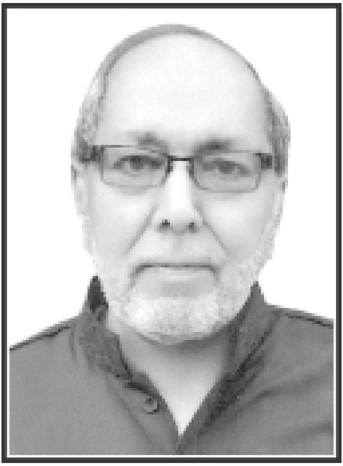

نسیم سحر

ایک لفظ کی نسبت سے بھی انھیں اپنا استاد کہہ سکتا ہوں۔ اسی طرح حافظ عبدالغفار واجد سے بھی بہت دوستانہ اور نعت کے حوالے سے قریبی تعلق ہے۔ یہ تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ الحمدللہ، اب عمران تنہا بھی کامونکی شہر سے میرے حلقۂ احباب اور نعت قبیلے میں شامل ہو رہے ہیں تو مجھے مسرت ہو رہی ہے۔

عمران تنہا کی اس کتاب میں میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اکثر نعتیں طویل ہیں۔ عام طور پر نعت گو شعرا کی نعت چھ سات اشعار پر ہی مشتمل ہوتی ہے، لیکن عمران تنہا کے اس مجموعے میں عموماً اس سے زیادہ اشعار کی نعتیں ہیں اور سچ پوچھیں تو یہ حنیف نازش قادری صاحب کی روایت کا ہی تسلسل ہے، اور عمران تنہا نے حقِ شاگردی یوں ادا کر دیا ہے کہ ان طویل نعتوں میں کوئی نعت کا شعر بھی بھرتی کا نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے کتاب میں شامل مضمون میں نامور محقق، ناقد اور شاعر ڈاکٹر سرور حسین نقشبندی نے کیا خوب کہا ہے کہ: ''عمران تنہا دبستانِ حنیف نازش کی بلبلِ خوش نوا ہے''۔

ان کا ہر شعر اپنی جگہ ایک منفرد مفہوم، ایک منفرد مضمون اور ایک مختلف وحدت کا عکاس ہے۔ طویل ردیفوں کے علاوہ مختصر ردیفوں میں بھی ان کی نعتیں عمدہ ہیں۔ تاہم ان کی کچھ نعتیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ خاص طور پر نعت خوانوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ ان کے الفاظ بھی ایسے ہیں کہ ان نعتوں میں ابلاغ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے: یہ فوری طور پر قاری تک پہنچ جاتی ہیں اور نعت خوانوں کے ذریعے سامعین تک پہنچ جاتی ہیں۔ تاہم سچ کہیں تو ایسی نعتیں عمران تنہا جیسے زرخیز اور ذہن شاعر کی پہچان نہیں ہیں۔

غزل کی طرح نعت میں بھی نئی اور اچھوتی ردیف چاہے وہ یک لفظی ہو یا طویل، یا طویل تر، شاعر کو یہ سہولت دیتی ہے کہ وہ اس ردیف کے تحت نیا مضمون اور نیا موضوع تخلیق کر سکتا ہے۔ ان کی چند ردیفیں دیکھ کر یہی تاثر ہوا کہ وہ ان نئی ردیفوں سے اپنی نعت یا شاعری میں نئی کشش، نئی معنویت، گہرائی اور حبِ رسولؐ اللہ کا اظہار ایک منفرد لہجے میں کر رہے ہیں۔ ان کی کچھ طویل ردیفیں دیکھیے: ضرورت نہیں پڑتی، کی خیر ہو، ہے قسم خدا کی، تقسیم کرتے ہیں، کی کیا بات ہے، تسبیح کرتے ہیں، قربان ہوئے جاتے ہیں، نقشِ پا، سبز گنبد، انگشت بدنداں، نعت ہے، تو مزہ آ جائے۔ اسی طرح انھوں نے کچھ نعتوں میں یک لفظی ردیفیں برت کر بھی اپنی تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ مثلاً کبوتر، انگشت بدنداں۔

ان چند ردیفوں میں ان کے شعر ملاحظہ ہوں:

دیتا ہے شفا ایسے لعابِ دہن ان کا
خود رہ گئے بیمار بھی انگشت بدنداں

مدینہ ہو یا کا مونکی، وہ دیتے ہیں جہاں مانگو
اِدھر تقسیم کرتے ہیں، اُدھر تقسیم کرتے ہیں

..............................

کنواں لعاب دہن ڈال کر کریں میٹھا
جسے وہ چھو لیں وہی سلسبیل ہو جائے

..............................

مٹھی میں بو جہل کی جو پتھر کرے کلام
وہ بھی ہمارے واسطے عنوانِ نعت ہے

..............................

عمران تنہا نے اپنے نعتیہ مجموعے میں قرآن کریم کے کچھ الفاظ بھی خوب صورتی سے استعمال کیے ہیں جو کہ ان کے مطالعے کے غماز ہیں۔

''لاتقولوا راعنا'' ان کی سب سے اہم ردیف ہے جو کتاب کا عنوان بھی ہے۔ اس کی معنویت اس لیے زیادہ ہے کہ امتِ مسلمہ کو قرآن کریم میں ''لاتقولو راعنا'' کی آیت کے ذریعے ''راعنا'' کہنے سے منع کیا گیا ہے اور اس کی جگہ اسی مفہوم کے الفاظ ''اُنظرنا'' کہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ چونکہ ''راعنا'' یہودیوں کی لغت میں بے ادبی کے کلمے کا درجہ رکھتا تھا اور وہ اسے بری نیت سے استعمال کرتے تھے، چنانچہ اسی تناظر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ قرآنی آیت نازل ہوئی جس میں ''راعنا'' کہنے کی ممانعت فرما دی گئی اور اس معنی کا دوسرا متبادل لفظ ''انظرنا کہنے کا حکم ہوا۔ اس آیت کی ہدایت میں عمران تنہا نے اپنی کتاب کا خوب صورت نام، جس میں مناہی کا بھی حکم ہے اس سلیقے سے کیا ہے کہ گرفت میں نہیں آتے۔ مثلاً ان کی اس نعت کے دو شعر دیکھیں اور انہیں داد دیں:

ان کے چہرے دیکھ لینا جب بھی اُنظرنا کہو
بدنما کفار ہوں گے ، لاتقولوا راعنا

اے منافق سن کہ یہ الفاظ مومن کے لیے
باعثِ آزار ہوں گے، لاتقولوا راعنا

..............................

نعت خوانوں کی مقبولیت اور محافل میں ان کی پسندیدگی، اور اس کے مقابلے میں نعت گو شعرا کی کم مقبولیت پر انھوں نے اپنے اس شعر میں بڑا لطیف سا طنز کیا ہے، اور یہ شعر واقعی ہمارے معاشرے کے رجحان کی ترجمانی کر رہا ہے:

نعت خواں حضرات تو ہوتے ہیں مقبول عوام
شاعروں کے واسطے بھی داد ہونے چاہیے

..............................

عمران تنہا کی اس کتاب میں کچھ مسلکی معاملات پر بھی نعتیہ شعر ہیں، ایک شعر ملاحظہ ہو:

میں ہوں وہ سنی جو باادب ہے، جو بامروت ہے، باحیا ہے
مرا طریقہ تو بس ازل سے وفا رہا ہے، قسم خدا کی

..............................

اس طرح کے ایک دو شعر اور بھی ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نوجوان نسل کو خاص طور پر اپنے ملک کی صورت حال کو دیکھ کر، اس

طرح کی شاعری کر کے امتِ مسلمہ میں اتفاق کی فضا کو آلودہ نہیں کرنا چاہیے، بل کہ اس کے بجائے موجودہ صورتِ حال کی اصلاح پر توجہ دینی چاہیے جس کی اشد ضرورت ہے۔ اس طرح کے تیروں کا نشانہ اپنی صفوں کے بجائے دشمنوں کو بنانا چاہیے، جیسے خود عمران تنہا نے ان دو شعروں میں کس قدر لاؤڈ انداز میں بیان کیا ہے:

جھوٹی نبوتوں کا اب اعلان بند کر
مرزے کے پیروکار، یہ ہذیان بند کر

.................................

اُنؐ کا ادب نہیں تو جہنم رسید ہو
بخشش کا اپنی روزنِ امکان بند کر

.................................

اور اسی نعت کے مقطعے میں ان کے تیور یہ ہیں:

تنہاؔ قلم سے تیغ کا تُو ایسے کام لے
سب بدتمیزیوں کے یہ طوفان بند کر

.................................

سچ یہ ہے کہ اس طرح کے شعر وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اگرچہ اتنے بلند آہنگ لہجے کے بجائے عمران تنہا ذرا دھیمے لہجے میں بھی بات کر سکتا تھا، لیکن مسلکی شاعری کے مقابلے میں ایسے شعر زیادہ قابلِ قبول ہیں کہ ان کا نشانہ امتِ مسلمہ نہیں بل کہ اس کے دشمن ہیں۔

عمران تنہا نے خواجہ حیدر علی آتش اور فیض احمد فیض جیسے معروف اساتذہ کی کچھ معروف زمینوں میں بھی شعر کہے ہیں اور وہاں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے، فیض کی معروف زمین ''چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے میں ان کی نعت کا شعر دیکھیے:

نہیں مجال کسی کی، نظر اٹھا کے چلے
ہوا بھی شہرِ محمدؐ میں سر جھکا کے چلے

.................................

جناب سعید قریشی کا مضمون بہت عمدہ ہے اور سچ یہ ہے کہ انھوں نے عمران تنہا کی نعت گوئی کی خصوصیات کا حق ادا کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنے اس مضمون کا عنوان ''تھپکی'' رکھا ہے اور یہ تھپکی اتنی خوب صورت ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ عمران تنہا کو ایک تھپکی میری طرف سے بھی اسی محبت سے پہنچ جائے۔

عمران تنہا کا یہ پہلا نعتیہ مجموعہ ہے جس کی اٹھان دیکھ کر کسی قسم کی حوصلہ افزائی کے بغیر، پوری صداقت اور یقین کے ساتھ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ عمران تنہا وقت سے بہت پہلے، کائناتِ نعت میں اپنی اور کاموکی کی پہچان بنیں گے، اور اپنے لیے ایک منفرد مقام پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اساتذۂ کرام کا نام بھی روشن کریں گے۔ ان شاء اللہ کل کے نعتیہ منظرنامے میں ان کا نام حبِ رسولِ کریمؐ کی نسبت سے چمکتے ہوئے حروف میں لکھا جائے گا۔ یہ میری دعا بھی ہے اور توقع بھی۔

وما علینا الا البلاغ۔

☆☆☆☆☆

# یاد پھر سے مجھے گزرے زمانے آئے [آپ بیتی]

سلمیٰ اعوان

دسمبر یا جنوری کے مہینوں میں بڑے ماموں کی نیچے میدانی علاقوں میں آنے کی ہنگامہ آرائی ہمارے لیے کسی تہوار کی طرح ہی پر مسرت ہوتی۔ منجھلے ماموں بھی انہی دنوں سالانہ چھٹی پر آجاتے۔ ہماری چھیتی بوا جی بھی ساتھ ہوتیں۔ اور یہ بات ہمارے لیے مزید خوشی کا باعث ہوتی۔

اس ضمن میں دو اہم واقعات سدا یادوں میں جھلملاتے رہتے ہیں۔ پہلا بڑے ماموں کے ساتھ ڈھیروں ڈھیر خشک میوے، اور سیبوں کی پیٹیاں اور گول مٹول عفت اور کوثر بہت خوبصورت شنیل کے فراکوں میں اچھلتی کودتی ربڑ کی گڑیاں سی لڑکیاں آتیں۔ ہم ان کے آگے پیچھے پھرتیں۔ ہر کوئی انہیں گود میں اٹھانے کے لیے مرا جاتا۔

سب سے نازک لمحہ وہ ہوتا جب ایک بڑی سی سینی میں ڈرائی فروٹ اور دوسری میں سیب اماں کو بھیجے جاتے۔ اگر تو اماں حالت امن میں ہوتیں تو پھر ہمیں قبولیت یا انکار کے جانگسل لمحات میں سے گزرنا نہیں پڑتا تھا۔ بسم اللہ اور ویر کی لمبی زندگی کی دعا کے ساتھ تھالوں کو پذیرائی ملتی اور ہماری

براچھیں خوشی سے گالوں تک چڑھ جاتی تھیں۔ ہاں اگر حالت جنگ ہوتی تو بس پھر ان تھالوں کی آنیوں اور جانیوں کے دورانیئے کا سفر بڑا ہی کربناک ہوتا۔ گو آخر میں سب کچھ ٹھیک ہی ہوجاتا کہ تان بڑے ماموں کے بہ نفس نفیس آجانے پر ٹوٹتی۔ مگر یہ فضول سی ڈرامہ بازی ہم معصوم چٹوروں کو تو مار ہی ڈالتی۔

باقی بچوں کا تو مجھے کچھ یاد نہیں ہاں البتہ مجھے ماں جی کے کمرے سے آگے جو کوٹھڑی سی تھی ہمیشہ ہی کسی پراسرار خزینے کی طرح نظر آتی۔ دراصل ڈرائی فروٹ کے بورے اسی میں رکھے جاتے۔ زمینوں سے آئے گڑ شکر کا ٹھکانہ بھی یہیں ہوتا۔ دن میں جب کبھی فامی ماسی یا ہماری بوا جو ہماری مہمانی بھی تھیں کا چکر وہاں لگتا تو وہ مٹھی بھر توت یا خوبانیاں نکال لاتیں اور انگنائی میں موجود جتنے بچے بھی موجود ہوتے اُن کی ہتھیلیوں پر یوں رکھتیں جیسے دروازے پر کھڑے فقیر کے پھیلے کشکول میں نخرے والی گھر گھرہستن مٹھی بھر آٹا ڈالتی ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا کاش میرے پاس کوئی سلیمانی ٹوپی ہوتی تو میں غڑاپ سے اندر جا گھستی اور اخروٹ بادا موں سے جیبیں بھر لاتی۔

دوسرا اہم واقعہ گھر بھر کے بڑے افراد کی اپنے مرحوم والد کے لیے ایک ہفتہ مسلسل قرآن خوانی کا اہتمام ہوتا۔ میری نانی کے سبھی بچوں کو اپنے باپ سے عشق کی حد تک پیار تھا۔ اس پیار کی شدت کے اظہار کے لیے یہ چھوٹی سی مثال ہی کافی ہے۔ اپنے والد کی وفات پر اماں اور ان کی بڑی بہنوں نے اپنے میکے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ ہر روز قبرستان جانا، رونا اور قرآن پڑھنا۔ گھر میں موجود گائیں بھینسیں کھڑی ڈکرا رہی ہیں کہ انہیں وقت پر دھولیں۔ بیٹیوں کو رونے دھونے سے فرصت نہیں۔ ماں غصے سے اٹھا کر بالٹی ہاتھوں میں تھماتے ہوئے باڑے کی طرف ہانکتی ہے۔ ہماری اماں غصے سے چلتی ہوئی کہتی ہیں۔ اللہ میاں انہیں تو چھوڑ لے جائیں۔ کوئی وقت قبولیت کا ہوتا ہے واقعی جھاڑو ہی پھر گیا تھا۔ بھینس اور دو گائیوں نے دودھ دینا بند کردیا تھا۔ پتہ نہیں کون کون سے جتن کرنے پڑے۔ کتنی دعائیں مانگی گئیں۔ پھر کہیں اُن کے تھنوں میں دودھ اترا۔ ماں کی کتنی صلواتیں تینوں شادی شدہ بیٹیوں کو سُننی پڑی تھیں۔

تقسیم کے بعد تو سوائے دو بہنوں کے باقی سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ قرآنی ناظرہ پر سب کو غیر معمولی کمانڈ تھی۔ میاں جی کے لیے قرآن

پڑھنا ہے- ہماری امّاں اس ضمن میں سب سے آگے ہوتیں- فجر کی نماز کے بعد سب بہن بھائیوں نے بڑے کمرے میں چارپائیوں پر بیٹھ جانا ہے- شٹیل کی رضائیوں سے پاؤں ڈھانپ لیتے ہیں- بواجی نے قرآن نہیں پڑھا تھا- تو وہ کچن سنبھال لیتیں- قرآن پاک ختم کرنے میں آٹھ لوگوں کو ڈیڑھ دو گھنٹے لگتے- دعا مانگی جاتی اور جب وہ سب میاں جی کی باتیں کرتے کرتے کہیں آنسو بھری آنکھیں صاف کرتے اور کہیں ہنستے- بواجی دیسی گھی میں پکے خستہ خستہ گرم پراٹھے رات کو خصوصی طور پر بنایا گیا سالن اور گرم چائے لے آتیں- پراٹھے پر سالن اور بھاپ اڑاتا چائے کا پیالہ ہر ایک کو سلیقے سے پیش کرنا بواجی کی ذمہ داری ہوتی-

کوثر، عفت تیسری چوتھی کلاس میں لاہور کے اس گھر میں آگئیں- بڑے ماموں کا خیال تھا کہ اُن کی ماں بہنیں ان کی بیوی کی نسبت بچوں کی زیادہ بہتر تربیت کر سکتی ہیں- یوں بھی پڑھائی کا معیار بہرحال لاہور میں گلگت سے تو بہت بہتر تھا-

دونوں معصوم جانیں دادی اور پھوپھی کے کنٹرول میں آگئیں- صفو ماسی کی تو شادی میرے منجھلے چچا سے ہوگئی تھی- یہ بھی ایک داستان تھی- میرا چچا بھی صفو ماسی کا سچا عاشق تھا- مگر کیا مجال کہ اُس نے اظہار کا ایک لفظ بھی کبھی منہ سے نکالا یا اپنے اس یک طرفہ عشق کی بھنک بھی کسی کے کانوں میں پڑنے دی-

ہماری امّاں اس کی واحد رازدار تھیں- پہلے تو انہوں نے دیور کو سمجھانے کی کوشش کی- ''کہ دفع کر بڑا دماغ ہے اس کا-'' پر نہیں جی وہ بڑا سچا عاشق تھا-

ایک رات جب دیور بھاوج سمجھ رہے تھے کہ بچی سو رہی ہے- وہ امّاں کے سامنے گھگھیاتے ہوئے اپنی حالت زار بیان کر رہا تھا-

بی بی جیسے بھی ہو میری خاطر سوال ڈال دے- رسالپور جہاں اس کی پوسٹنگ تھی میں ایک پہنچے ہوئے بزرگ نے بھی اُسے یقین دلایا تھا کہ اُس کے من کی مراد ضرور پوری ہوگی-

ہماری امّاں کی اپنی ساس، نندوں اور دیوروں سے بہت بنتی تھی- اب اس اتنی شدید خواہش کو ٹالنا اُن کے لیے بھی ممکن نہ تھا- بس جان لڑانے والی بات ہی تھی- کامیاب ہوگئی تھیں- میرا خیال ہے صفو ماسی کو ہمارے چچا کچھ خاص پسند نہ تھے- بس خاندانی پریشر میں آگئیں- مگر اُن کا زیادہ وقت پھر بھی میکے کے گھر میں ہی گزرتا تھا- دراصل وہ بہت سمجھدار اور زیرک تھیں-

خاندان کا ہر معاملہ اُن کے مشورے اور رائے کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

چھوٹے ماموں کی پوسٹنگ پشاور ہو گئی اور شفقت کو بھی لاہور بھیج دیا گیا - گھر لڑکیوں سے بھر گیا تھا۔ چھوٹی لڑکیاں کوثر عفت اور ذرا بڑی شفقت۔ رضیہ حمید کی تین بہنیں اور ہم دو رضیہ حمید اور میں۔

ہمارے لیے اپنے دکھڑے پھرولنے اور ایک دوسرے کی دلجوئی کرنے کا بہترین وقت سردیوں کی ٹھٹھرتی شاموں کا ہوتا جب گھر کی بڑی عورتیں نیچے کھانا پکانے کے لیے اتر جاتیں۔

تیزی سے ڈوبتا سورج، شفق کی لالی سے سرخی مائل مغربی آسمان، پرندوں کی ڈاروں کی گھر واپسی کی اڑانوں کا منظر، گھروں سے اٹھتے دھوئیں کے بادل اور ہر سو پھیلی گھمبیر سی اداسی کوثر، عفت اور شفقت کو بے طرح مغموم کر دیتیں - اُن کی خوبصورت آنکھیں اپنے اپنے والدین کی یاد میں بھیگنے لگتیں۔ ہم دلجوئی کے لفظوں سے اُن کا دکھ بانٹنے کی اپنی سی کوشش کرتے - جب نیچے سے فامی ماسی یا ماں جی کی کڑک دار آواز سنائی دیتی۔

"نیچے آؤ۔ اوپر کیا کر رہی ہو؟" اور تینوں اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دیتیں۔ ہاں چھٹپنے کا یہ وقت گزر جانے کے بعد بہت سی تبدیلیاں آ گئیں - کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جانے والی لڑکیاں جو کسی نہ کسی کے گھر میلا دکھانے کا بہانہ کر کے فلم دیکھنے بھی جانے لگی تھیں۔ چھوٹی موٹی خریداری کے لیے رنگ محل اور انارکلی کا پروگرام بنتا۔ سچی بات ہے لنڈے بازار سے آگے دلی دروازے رنگ محل کناری بازار سے چھتہ گلی بازار سے ہوتے ہوئے لوہاری دروازے سے نکلا کرتیں - پکوڑے کھاتیں، گرم گلاب جامنوں کے مزے لوٹتیں - بانو بازار کی چاٹ کھائے بغیر تو گھر واپسی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

ہماری محبتیں اسی گھر میں پروان چڑھیں اور تناور درخت بنیں اور سچی بات ہے یہ آج تک اسی شدت سے قائم ہیں۔ خدا انہیں قائم رکھے:

جیسے پھر ہاتھ میں خوشبو کے خزانے آئے
یاد پھر سے مجھے گزرے زمانے آئے
اور دہلیز پر آجاتی ہیں یادیں پرانی
لوٹ کے پھر نہیں بچپن کے زمانے آئے
یاد پھر سے مجھے وہ دور پرانے آئے

☆☆☆☆☆

# رانا محمد شاہد ...... لگن کی کمیاب مثال

جی صاحبو! لکھنے پڑھنے کو مرکز بنانے والے تیزی سے کم ہو رہے ہیں۔ ایسا لکھنا پڑھنا جس میں کوئی مادی فائدہ نہ ہو، صرف روحی تسکین صلہ بنے___ بھلا کون اس کی تائید کرے گا! سماج نے جن معیارات کو چن لیا، وہ یکسر مختلف نوعیت کے حامل ہیں۔ عالی شان منصب، بیش قیمت گاڑی، پوش ایریا میں بڑا سا گھر، ایلیٹ کلاس سے میل جول وغیرہ___ ایسے میں ایک فرد اپنے شب و روز کتابوں کی دنیا میں یوں بسر کرنے کو ترجیح بنا لے کہ مذکورہ جملہ کششیں کہیں دور رہ جائیں؛ اس کا کوئی حوالہ بنتا ہے تو اس ضمن میں ایک نام رانا محمد شاہد بھی مذکور ہوں گے۔

اسے دلچسپ پہلو کہیے کہ شاہد کاغذ کی دنیا کے شخص ہیں۔ اب جبکہ ہر کہ ومہ سکرین پہ شفٹ ہو چکا، یہ پھر بھی اصلی رسالے/کتاب کو فوقیت دیتے ہیں۔ شاید خوگر پیکر محسوس ہونے کے باعث! احباب کے اصرار پہ یہ ڈیجیٹل/ورچوئل سنسار سے قدرے مربوط تو ہوئے ہیں مگر اسے کچھ سراب ہی گمان کرتے ہیں، جیسے یہ محض دام خیال ہو۔ یوں وہ اچھاتی کو وقتی شہرت ان پہ تا حال فریفتہ نہیں ہوئی، جس پہ اک زمانہ مرمٹا ہے۔ ربع صدی سے لائبریری جا آ ہی نہیں رہے، اپنا کوالٹی ٹائم بیچ مچ کی کتابوں کے بیچ گزارتے ہیں۔ مختلف اخبار و رسائل میں باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں۔ سیاست سے کچھ گریزاں لیکن معاشرتی قضیوں کی جانب راغب۔ دھیرے دھیرے ادب کی قلم رو میں بھی قدم رکھا۔ شاہد کی مطبوعہ تو '9' کتب زیادہ تر سوشل ایشوز پر ہیں۔ فکری مسائل بھی ان میں موجود ملیں گے۔ ادبی صورت حال پر بھی خامہ فرسائی کی مگر کم۔ گویا ان کی ذہنی تربیت بمنزلہ رہبر اپنی موجودگی باور کراتی رہی: لے سانس بھی آہستہ----- حزم واحتیاط لازم کہ یہ حساس مدار ہے، اس کے آگے کچھ نہیں! اس طرح

جمیل احمد عدیل

نان فکشن سے فکشن کی طرف ان کی آمد عجلت کا مظہر نہیں بنی- کہانیاں پڑھیں تو کہانی لکھنے پہ من مائل ہوا- زیر نظر افسانوی مجموعہ:

مگر____

کہاں زندگی ہے

شاہد کی دسویں کتاب ہے- جس میں بائیس کہانیاں شامل کی گئی ہیں- اپنی ادبی فکری مسافرت کے اعتبار سے انھوں نے جامع پیش لفظ قلم بند کیا ہے- یہ تحریر 'پیش لفظ' سے زیادہ ہے- پورے سات صفحات کو محیط- جسے پڑھ کر مصنف کی لفظ وحرف سے وابستگی کا علم ہوتا ہے-

جہاں تک رانا محمد شاہد کی کہانیوں کا معاملہ ہے تو اپنے اس پہلے مجموعے میں وہ Passion رکھنے والے رائیٹر نظر آتے ہیں- اپنے گردوپیش سے خوب آگاہ- کرداروں کی نفسی کیفیتوں سے اچھی طرح واقف- ان کے کرداروں میں ماورائیت بالکل نہیں ملے گی- یہ جیتے جاگتے ہماری ہی سوسائٹی کے وہ لوگ ہیں جنھیں ایک طرف فکر روزگار لاحق ہے تو دوسری جانب غم الفت سے بھی نمٹ رہے ہیں- مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے یہ مردوزن کن الجھنوں کو سلجھا رہے ہیں- یہ ہمارا دیکھا بھالا ہے- اصل ہنر یہ کہ ماجروں میں کیسے پرویا گیا ہے- شاہد کہانی بننے کی استعداد رکھتے ہیں- البتہ وہ سادہ و بے تصنع متن بناتے ہیں- اسی لیے قاری اس میں جذب ہو جاتا ہے- کاریگری اور کرافٹ کے شعبدے بعد میں مصنف سیکھ ہی لیتا ہے پر کھری، بے ساختہ کہانی کا اپنا لطف ہوا کرتا ہے- شاہد نے جو لکھا اس میں آمد ہی آمد ہے، کہیں آورد کا شائبہ بھی نہیں ملے گا- یوں ان کی نثر میں برجستگی اور تاثیر کی کارفرمائی خواندہ کو گرویدہ بنا لینے والی ہے- زندگی کا اوریجنل فائبر دیکھنا مطلوب ہو اور معاشرے کے حقیقی شیڈز سے لگاؤ ہو تو اس جواں سال ادیب کی کہانیاں ضرور پڑھنی چاہئیں- ایسی لکھتیں قاری کو تھکاتی نہیں اسے تازہ دم کرتی ہیں-

ایک بات اور کہنی ہے کہ شاہد جیون کے نشیب و فراز کو دردمند آنکھ سے دیکھتے ہیں- بطور افسانہ نگار ان کی نگاہ ایسوں پہ رکتی ہے- حیات کے یہ چھوٹے چھوٹے سے دکھ اندر ہی اندر زخموں کی لو بن جاتے ہیں- یہی دیے کہانی میں روشن ہوتے ہیں کہ زیست اصولی طور پر طرب نہیں کرب ٹھہری- کہانی کار کی یہی حزن آشنائی اسے آگے چل کر مشاق افسانہ نگار بنائے گی- شاہد ایک مخلص حبیب ہیں، ان کی تحریریں بھی اپنے اخلاص کی بدولت پڑھنے والے کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں- یہاں صرف ایک افسانے کا مجمل ذکر کیا جاتا ہے- اس کا عنوان ہے: "ہم سفر"- یہ کہانی اکیس صفحات کو محیط ملے گی- اس کے باوصف قاری کو کہیں دم نہیں لینے دیتی- مثالی بہاؤ کی مالک- رومان اور کشمکش کے دھاگوں سے اس کی Knitting ہوئی ہے- پلاٹ گتھا ہوا- طوالت کے باوجود سرے کہیں باہر نہیں ہوئی- کہانی نویس کی واقعات اور جذبات پہ عمدہ گرفت نظر آتی ہے- محبت کا موضوع اگرچہ نیا نہیں مگر بات کہنے کا سلیقہ ہو تو ندرت کا اہتمام کیا جا سکتا ہے- اس کہانی میں ناولٹ بننے کا بھرپور پوٹینشل موجود ہے-

کتاب کی طباعت حسن ذوق کی خبر دیتی ہے- سرورق بھی بہت جاذب-

عزیزم شاہد! دعائیں آپ کے لیے

اللھم زد فزد

☆☆☆☆☆

# شکیب جلالی...... مُلکِ سخن کا شہزادہ

یہ عنوان ہے اس کتاب کا جو اس سال شکیب جلالی کی زندگی اور شاعری پر مصنفین کی مثلیث یعنی امیر حسین جعفری، ڈاکٹر خالد سہیل اور حسین اقدس رضوی (شکیب جلالی کے فرزند ارجمند) نے مل کر لکھی ہے۔ اس کتاب کی تقریبِ رونمائی کل فیملی آف دی ہارٹ کے زیرِ اہتمام ریکسڈیل کمیونٹی ہب میں منعقد ہوئی۔ شرکا کی ایک بڑی تعداد جو شکیب جلالی سے محبت و عقیدت رکھتی ہے، نے شرکت کی۔ کتاب پر جن احباب نے خیال آرائی کی، ان میں ڈاکٹر خالد سہیل ماڈریٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے جبکہ مقررین میں شاہد اختر، سارہ علی، وسیم گردیزی، حامد یزدانی، امیر حسین جعفری شامل تھے جبکہ خاکسار نے بھی اپنی مختصر گزارشات پیش کیں۔

کتاب کی اشاعت و رونمائی نے اس پہلی بوند کا کام کیا ہے جس سے حق بہ حق دار رسید کی طرف اپنا رخ کیا ہے۔ بلاشبہ شکیب جلالی اردو شاعری میں ایک ایسا بڑا نام ہے جو اپنی جواں مرگ کے باوجود تخلیقی وفور کا ایسا بھرپور خزانہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے جس پر مکمل تحقیق، تفہیم واستناد پران کے ہم عصر پوری طرح گرفت نہ کر سکے تھے اور آج تک ان کی شاعری اپنے ایک حقیقی شارح کی تلاش میں سرگرداں و پریشاں ہے۔

شکیب جلالی نے خود کہا تھا:

ادھر سے گزرا تھا ملکِ سخن کا شہزادہ
کوئی نہ جان سکا، ساز و رخت ایسا تھا

---

کتابیں لکھنے کی وجوہات میں کئی عوامل شامل ہوتے ہیں۔ اس کتاب کا ایک مقصد بقول ڈاکٹر خالد سہیل، امیر حسین جعفری کو ان کی صحت یابی کے بعد ان کی طبیعت پر در آنے والے تخلیقی انقباض یا اس کا یخ توڑنے کے لیے انھوں نے سوچا کہ کس طور امیر کو دوبارہ لکھنے پڑھنے کی طرف مائل کیا جائے۔ ان کے ذہن میں شاعری کے ساتھ امیر حسین جعفری کے پسندیدہ شاعر شکیب جلالی کے متعلق ان کو تحریر پر آمادہ کرنے کا خیال آیا - بظاہر وہ ایک مختصر معصومانہ سا سوال اپنے خط میں شکیب کی خودکشی کے بارے میں پوچھتے ہیں جو اس کتاب کا نقطہء آغاز ثابت ہوا۔

اس کتاب کی تفہیم میں مثلیث کا ایک اہم کردار ہے۔

پہلی مثلیث تو مصنفین کی ہے جنھوں نے مل کر اس کتاب کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

دوسری مثلیث کی مثال ڈاکٹر خالد سہیل

**احمد رضوان**

نے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں "تخلیقیت، دیوانگی اور روحانیت تینوں اوصاف کا تعلق انسان کے دائیں دماغ کے ٹیمپورل لوب سے ہوتا ہے"۔

تیسری مثلیث امیر حسین جعفری نے قائم کی جس کے تین کونے شکیب جلالی، اختر حسین جعفری اور خود امیر حسین جعفری ہیں۔ امیر اس میں خود کو ایک قاری کی شکل میں دیکھتے ہیں۔

چوتھی مثلیث جس کا ذکر اس کتاب میں ہے وہ مرگ، تصورِ مرگ اور انتظارِ مرگ سے ہے، جو شکیب جلالی، اختر حسین جعفری اور خود امیر حسین جعفری کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔

امیر حسین جعفری نے شکیب جلالی سے اپنے قلبی تعلق، ان کی شاعری تک کیسے ان کی رسائی ہوئی اور اس شاعری کی قرأت سے ان کے قلب و نظر پر جو بیتی اس کو صفحۂ قرطاس پر اتارنا شروع کر دیا۔ اس کتاب کو اگر نام نہاد نقاد تنقیدی نظر سے دیکھے گا تو یقیناً ٹھوکر کھائے گا۔ یہ محبت کا وہ لیکھا جوکھا ہے جو امیر کے قلب پر اترا اور اس نے اپنی محبت کے اظہار میں ڈاکٹر خالد سہیل کو شامل کر لیا۔ ڈاکٹر خالد سہیل چونکہ ادبی خطوط کی اہمیت کو جانتے اور مانتے ہیں اور اسے دو ادیبوں کے درمیان رابطے کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے ہیں اس لیے پوری کتاب خطوط کے تبادلوں پر مشتمل ہے۔ جہاں ایک فریق دوسرے کو خط لکھتا ہے اور اس سے کچھ استفہامی سوال جواب کرتا ہے۔ سید اقدس رضوی کا تحریری انٹرویو پانچویں خط سے شروع ہوتا ہے جس میں وہ اپنے والد کے حالاتِ زندگی سے متعلق بتاتے ہیں۔ اگر ہم شکیب کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں تو یہ ایک ایسی داستان ہے جس میں ہر رنگ موجود ہے۔ آس کا، یاس کا، قلبِ حساس کا، احساس کا۔ شکیب کے والد بدایوں سے تعلق رکھتے تھے اور پولیس کے محکمے میں ملازم تھے۔ ان کو نوکری سے غیر منصفانہ طور پر نکال دیا گیا۔ اس کی وجہ سے وہ دنیا کی بے ثباتی سے شاکی ہو کر راہ سلوک کی طرف مائل ہو گئے اور مجذوبیت سے مجنونیت کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی ذہنی حالت ایسی نہ رہی جو انہیں کسی کام کرنے کے قابل رکھتی۔ 1945 میں جب شکیب اپنی زندگی کے دسویں سال میں تھے تو وہ سانحہ رونما ہوا جو بعد میں ان کی اپنی خودکشی تک ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ان کے والدین ایک فوتگی سے واپسی پر ٹرین بدلنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے کہ والد پر دیوانگی کا دورہ پڑا اور انھوں نے اس حالت میں شکیب کی والدہ کو آتی ہوئی ٹرین کے آگے دھکا دے دیا۔ والدہ کی دونوں ٹانگیں کٹ گئیں اور وہ چند گھنٹوں بعد ہسپتال میں انتقال کر گئیں۔ مرنے سے پہلے اس نیک دل خاتون نے اپنے شوہر کو اس حادثے کے الزام سے بری الذمہ قرار دیا کہ ان کی ذہنی حالت درست نہیں ہے۔ ان کے والد کو پولیس نے گرفتار کرنے کے بجائے ذہنی امراض کے علاج کے لیے

نفسیاتی ہسپتال بھیج دیا جہاں وہ 20 سال تک داخل رہے۔ شکیب کے حافظے پر یہ حادثہ نقش ہو گیا اور جب تک وہ زندہ رہے اس کے کرب و اذیت سے باہر نہ نکل سکے۔ 20 سال بعد 1965 میں ان کے والد کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا مگر شکیب اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان آ چکے تھے۔ ان کو جب اپنے والد کی رہائی کا پتہ چلا تو ان سے ملنے کے لیے جانے کی تیاری کرنے لگے مگر اس دوران 1965 کی جنگ لگنے کی وجہ سے ویزے نہ مل سکے اور وہ نہ جا سکے۔ کچھ عرصہ بعد ان کے والد کی انتقال کی خبر آ گئی۔ شکیب اپنے والد کی وفات کے بعد غم واندوہ کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئے۔ یہی وہ بریکنگ پوائنٹ تھا جس کا انجام ان کی خودکشی پر منتج ہوا۔

ایک سال کے اندر اندر انھوں نے اسی طرح جیسے ان کی والدہ ٹرین کے آگے گری تھیں، انھوں نے خود کو اپنے والد کی جگہ رکھ کر اپنے آپ کو والدہ جیسی تکلیف دینے والے کام یعنی ٹرین کے آگے چھلانگ لگا دی اور ان کی ٹانگیں بھی کہتے ہیں کہ وہیں سے کٹیں جہاں سے ان کی والدہ کی کٹی تھیں۔ یہ خودکشی ان کی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں بتاتی ہے کہ کس کرب سے وہ اپنی ساری زندگی گزرتے رہے۔ والد کی بیماری ایک ایسی موروثی بیماری تھی جس کے اثرات شکیب میں موجود تھے۔ شکیب کی خودکشی کے محرکات کے متعلق ڈاکٹر خالد سہیل اس کتاب میں لکھتے ہیں کہ نمایاں محرکات میں ان کی موروثی بیماری کے ساتھ ساتھ ان کے ہم کار اور معاشرہ میں موجود معاندانہ رویوں کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے۔ لوگ ان کی ذہنی چلا سے حسد کرتے تھے اور ان کے فن کو اس انداز سے پذیرائی نہیں دیتے تھے جس کے وہ مستحق تھے۔

ان کی خودکشی میں ایک بڑا محرک یہ بھی تھا کہ وہ اپنے زمانے سے مطابقت نہ کر سکے۔

شکیب کی زندگی اور اس کے نفسیاتی مسائل پر ڈاکٹر خالد سہیل نے اپنا نفسیاتی تجزیہ بہت عمدگی سے بیان کیا ہے شکیب کی ذہنی حالت اور ڈپریشن کا مناسب علاج نہ ہو سکا، نہ انھیں کوئی ایسا غمگسار میسر آیا جو ان کے خودکشی والے خیالات کے متعلق آگاہ ہو کر انھیں اس اقدام سے بچنے کے لئے اپنا کردار ادا کرتا اور اسے اس حالت سے باہر لانے میں اپنی سی کوشش کرتا۔

وزیر آغا سے جب شکیب کی ملاقات ہوئی اور اس نے اپنا درد بیان کیا تو وہ بھی شکیب کو مناسب مشورہ نہ دے سکے۔ مجھے یہاں احمد بشیر اور ابن انشاء کی مثال یاد آتی ہے کہ احمد بشیر نے کس طرح ابن انشاء کو خودکشی کے بارے پڑنے والے دوروں سے نکالا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اکثر ابن انشاء رات کو ان کے پاس آتا، وہ سمجھ جاتے دورہ کی کیفیت ہے۔ احمد بشیر کہتے ہیں کہ وہ اس کو ساتھ لیے ساری رات سڑکوں پر گھومتے رہتے اور طریقے سوچتے کہ کیسے خودکشی کی جائے جس میں تکلیف بھی نہ ہو اور انسان اپنی زندگی کا خاتمہ کر

لے۔ یوں سڑکوں پر گھومتے گھومتے وہ ابن انشاء کا کتھارسس کرنے میں کامیاب رہتے اور صبح کے آثار ظاہر ہونے پر دورے کا زور ٹوٹ جاتا اور دونوں دوبارہ گھر لوٹ آتے۔ کاش شکیب کو بھی ایک احمد بشیر میسر آجاتا یا ڈاکٹر خالد سہیل جیسا مسیحا تو شاید ان کی زندگی نارمل ہونے کی طرف آجاتی مگر شدنی شد۔

امیر حسین جعفری نے کتاب کے بارھویں ادبی محبت نامے میں شکیب سے اپنی محبت اور عقیدت اور اس کی فکروفن کو سمجھنے کے لیے وینٹیج پوائنٹ سے دیکھنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ تصور مرگ ہی وہ وینٹیج پوائنٹ ہے جو انہوں نے اختر حسین جعفری' شکیب جلالی اور خود اپنے درمیان قائم کیا۔ امیر حسین جعفری نے شکیب فہمی کے سلسلے میں ان کی شاعری کو سبقاً سبقاً نہیں پڑھا بل کہ ہر شعر کو اپنے اوپر یوں طاری کر کے پڑھا جیسے یہ ان پر بیتا ہو۔ اس وقت بلاشبہ شکیب فہمی پر اگر کوئی شاعر پوری طرح قادر ہے تو وہ امیر حسین جعفری ہے۔ شکیب تک امیر کو پہنچانے والے خالد احمد بھی شکیب کے عاشقوں میں سرفہرست تھے۔

شکیب کو جدید اردو غزل کا بانی شمار کیا جاتا ہے۔ رجحان ساز غزل گو شاعر جو جدید تلازمے، خیال کاری، منظر نگاری کا ایسا امتزاج پیش کرتا ہے جو ان کی شاعری کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز بناتا ہے۔ روایتی مضامین ان کی شاعری میں نہ ہونے کے برابر تھے۔ شکیب کی شاعری فرد کی سطح پر ان کی اپنے آپ سے وہ خود کلامی ہے جس میں وہ اپنے ذہنی تناؤ اور خلش کو الفاظ کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ استمداد زمانہ اور وقت کی ناقدری، حاسدانہ رویے، ادبی چشمک، ذہنی بیماری وہ سب عوامل تھے جنھوں نے اپنا کردار ادا کیا۔ والد کی ذہنی بیماری، والدہ کی ٹرین کے آگے موت اور ان کی اپنی خودکشی کی ناکام کوششیں۔ اگر ہم ادب میں ایسی مثالوں کی طرف دیکھنا شروع کریں تو ہمیں خودکشی کرنے سے قبل ناکام کوششیں کرنے والوں میں، سلویا پلاتھ، سارا شگفتہ، شکیب جلالی جیسے لوگ نظر آتے ہیں جنھوں نے ایک سے زیادہ بار اپنی زندگی ختم کر کے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔

اردو ادب میں اگر ہم خودکشی کرنے والے شاعروں کی فہرست پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں ان میں شکیب جلالی 1966، مصطفیٰ زیدی 1970، سید آنس معین بلے 1986، اور ثروت حسین 1990 نظر آتے ہیں۔ ان میں ثروت حسین اور شکیب جلالی کے والدین دونوں بدایوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جبکہ سید آنس معین اور ثروت حسین دونوں نے شکیب جلالی کی طرح ٹرین کے آگے کود کر خودکشی کا انتخاب کیا بقول حسین اقدس رضوی یہ دونوں شکیب جلالی سے متاثر تھے اور انھی کی طرح اپنی زندگی کو ختم کیا۔

ثروت کا یہ شعر شکیب جلالی، سارا شگفتہ اور خود ثروت کے کیس میں ان پر صادق آتا ہے:

موت کے درندے میں اک کشش تو ہے ثروت
لوگ کچھ بھی کہتے ہوں خودکشی کے بارے میں

☆☆☆☆☆

# پروفیسر سحر انصاری کی شاعری میں صوفیانہ رنگ

دنیائے بے ثبات میں زندہ وہی لوگ زندہ رہتے ہیں جو کچھ ایسا کام کر جاتے ہیں جو معنویت اور مقصدیت لیے ہوئے ہو، اور نسل آئندگان کے لیے مشعلِ راہ ہوں۔ پروفیسر سحر انصاری عصرِ موجود کے ادبی افق پر ایک مسلمہ اور بلند قامت کی حامل ادبی شخصیت ہیں۔ آپ ملنسار، شفیق اور رئیس الاساتذہ ہیں۔ آپ کی روشن کی ہوئی شمعیں اس وقت ادبی منظر نامے کو ضوبار کیے ہوئے ہیں۔

مبین مرزا لکھتے ہیں کہ

"سحر انصاری دوست دار آدمی ہیں۔ وہ مجلسی مزاج رکھتے ہیں، اُن کے ملنے والوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ اُن کی دل چسپی کے حوالوں کا دائرہ بھی خاصا پھیلاؤ رکھتا ہے، یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں اور ایک آدمی، کسی بھی آدمی کے طرزِ زندگی کو سمجھنے اور جاننے کا بنیادی حوالہ بن سکتی ہیں لیکن یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یہ سارے پہلو ایک شخصیت کا ظاہری رُخ سامنے لاتے ہیں، اُس کی باطنی جہت کو ہم پر نہیں کھولتے اور آدمی کو (بالخصوص سحر انصاری ایسے آدمی کو) ہم اُس کے ظاہر پر انحصار کر کے جان ہی نہیں پاتے۔ اس لیے کہ ایسے لوگوں کے یہاں دراصل اظہار خود کسی اخفا کا پردہ بن جایا کرتا ہے۔"

ایک تخلیق کار کے اظہار میں اس کا ظاہر اور باطن دونوں پائے جاتے ہیں مگر اس کو جانچنے کے لیے عمیق مطالعہ، فکر و فن کا جائزہ اور عصری رجحانات پر دسترس لازمی ہے۔

اکثر قدر دان اور پرستارانِ سحر انصاری ایک غزل سننے کی فرمائش کرتے ہیں جس کا ایک شعر زبان زدِ خاص و عام ہے:

عجیب ہوتے ہیں آدابِ رخصتِ محفل
کہ اُٹھ کے وہ بھی چلا جس کا گھر نہ تھا کوئی

رانا خالد محمود قیصر

درج بالا شعر کی تشریح و تمثیل نگاری کے لیے خاصا وقت درکار ہوگا اسی غزل سے ایک اور شعر توجہ کا طالب ہے:

کسی سے رنگِ افق ہی کی بات کر لیتے
اب اس قدر بھی یہاں معتبر نہ تھا کوئی

---

ایسے امثالی اشعار سند کا درجہ تو رکھتے ہی ہیں لیکن ایک جرأت اور قلندرانہ سوچ کا پتہ دیتے ہیں آیئے سحر انصاری کی شاعری میں ایک ایسے جوہر پر بات کرتے ہیں جو منفرد بھی ہے اور توجہ کا طالب بھی وہ موضوع پروفیسر سحر انصاری کی شاعری میں صوفیانہ رنگ ہے، صوفیانہ رنگ پر بات کرتے ہوئے ابن عربی کے نظریے وحدت الوجود پر ایک نظر:

''شیخ محی الدین ابن عربی (۵۶۰ء تا ۶۳۸ء) کے مطابق '' وحدت الوجو یعنی ہمہ اوست کا سادہ مطلب یہ ہے کہ خدا کائنات ہے اور کائنات خدا۔ اس سے زیادہ نہ کم۔ ابن عربی اپنی کتاب فصوص الحکم میں لکھتے ہیں'' وجود ایک حقیقت ہے۔ اس لیے ذات باری کے سوا کچھ باقی نہ رہا چنانچہ نہ کوئی ملا ہوا ہے نہ کوئی جدا ہے یہاں ایک ہی ذات ہے جو عین وجود ہے''۔

شاعر کو تلمیذ الرحمٰن کہا گیا ہے شاعر کے مشاہدات کا تعلق مظاہرِ قدرت سے جڑا ہوا ہے۔ مشہور فلسفی و صوفی امام محمد الغزالی 'احیاء العلوم' میں لکھتے ہیں:

''توحید کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ بندہ صرف ذات باری بقا کی ہی کو موجود دیکھے یہی صدیقین کا مشاہدہ ہے اور صوفیا ایسے ہی فنا فی التوحید کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مرتبے میں بندہ چونکہ وجود واحد کے سوا کچھ نہیں دیکھتا چنانچہ وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھتا اور جب وہ توحید میں اس استغراق کے باعث اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھتا تو اس ذات میں اس کا نفس اور مخلوق دونوں اس کی نگاہ کے لیے معدوم ہو جاتے ہیں۔''

ایک تخلیق کار کا یہ مشاہدہ نظریاتی بھی ہو سکتا ہے اور فکری بھی۔ مظاہر کائنات اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے شاہد ہیں۔ صوفی ازم اور صوفیانہ مباحث میں زندگی کے تمام معاملات زیرِ مطالعہ آتے ہیں اسی لیے صوفی ازم میں فلسفۂ وحدت الشہود کے مطابق'' کائنات خدا کا پرتو ہے حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں

'' کائنات و عالم چونکہ مرتبہ وہم میں بہر حال موجود ہے، اس لیے نفی صرف شہود کی ہونی چاہیے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جب سالک اللہ کے سوا کچھ نہیں دیکھتا۔ چنانچہ اس وقت اس کی توحید یہ ہے کہ وہ مشہود صرف اللہ کو مانے اور اسے صرف اللہ دکھائی دے رہا ہو''

شاعر میں بھی صوفی کی نظریاتی خصوصیات پائی جاتی ہیں گو وہ ظاہری نہیں ہوتی مگر ان کا تعلق فکری لحاظ سے باطنی ہوتا ہے جس کا اظہار وہ اپنے اشعار وافکار میں وقتاً فوقتاً کرتا رہتا ہے اس کے حقیقی معنی کسی سے متصف نہیں ہوتے مگر معنویت اور مقصدیت کے حوالے سے ادبی افق پر امر ہو جاتے ہیں۔

معنویت کے اعتبار سے تصوف وہ کلمہ ہے جو صفا سے مشتق ہے جس کے معنی صفائی کے ہیں" یہ صفائی ظاہری سے زیادہ باطنی ہوتی ہے دوسرے لفظوں میں باطن کو مخالفتِ حق کی کدورت اور سیاہی سے پاک وصاف کر دینے کا نام تصوف ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ لکھتے ہیں "صوفی وہ ہے جو اپنے وجود سے فانی ہو کر باقی بحق ہو گیا قید مزاج وطبائع سے آزاد ہو کر حقیقت حقائق کے ساتھ مل گیا ہو۔" کسی بھی تخلیق کار کے تخلیق کردہ فن پاروں میں ایسے شاہکار اشعار بھی ہوتے ہیں جو اس کے مزاج سے مطابقت تو رکھتے ہیں مگر صرف ظاہر نہ کہ باطنی:

میں کہوں اپنے باب میں اب کیا
منکرِ دیں کا دین و مذہب کیا

..............................

صوفیانہ انداز میں عملی یا سلوکی تصوف، بیعت، مرشد کی اطاعت، فکر، مراقبہ، چلہ کشی یا پھر روحانی سفر کا تذکرہ ملتا ہے مگر سحر انصاری کے ہاں ایسے مضامین ملتے ہیں جن کو قاری پڑھتا ہے اور سوچتا ہی رہ جاتا ہے:

میں ہوں اپنا شہود ، اپنی نمود
مجھ میں گم ہیں مرے زمان و مکاں

..............................

اک چراغ محفل ہوں بس یہ جرم ہے میرا
تیرگی سے لڑتا ہوں روشنی کی خاطر

..............................

مندر، مسجد، دیر، کلیسا پوچھ رہے ہیں ایک سوال
شہد سا مذہب لانے والے کب تیزاب بناتے تھے

..............................

شہود ونمود، مرے زمان ومکاں، چراغِ محفل، تیرگی سے لڑنا اور روشنی کا حصول ایک وقیع ریاضت کی نشاندہی کر رہے ہیں اس دشتِ بیکراں کی ریاضت میں وہ اپنی سعی، محنت اور ذہن کی کشادگی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ جہد مسلسل میں مصروف رہتے ہیں اور لحہ بہ لحہ کسی نئی منزل اور نئی فکر کے متلاشی نظر آتے ہیں یہ فکر تزکیۂ نفس، اخلاص، ذکر وفکر، محبت الٰہی اور اللہ کی مخلوق سے محبت اور فنا و بقا جیسے مراحل سے گزرتی ہے آپ اس ریاضت کے بارے میں یوں گویا ہوتے ہیں:

میں وہ مسافرِ دشتِ محبت ہوں
جو گھر پہنچ کے بھی سوچے کہ گھر نہیں آیا
آساں نہیں ہے کشمکشِ ذات کا سفر
ہے آگہی کے بعد غمِ آگہی بہت

☆

رہِ نجوم و کہکشاں دھول سی اُڑ رہی ہے، یاں
دیکھ بجز غبارِ جاں کون ہے کائنات میں

.................

یا پھر اس ضمن میں کلیات "سوادِ سخن" میں موجود نظم "خدا سے بات کرتے ہیں" ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

سحر انصاری کے فکر و فن کی استقامت پر نظر ڈالیں تو سمت کا فیصلہ کرنا ذرا مشکل نظر آتا ہے کہ ذیل کا شعر دینی اور دنیاوی اعتبار سے ایک سوچ ایک فکر اور اک نئی منزل کی جانب متوجہ کرتا ہے:

آدمی ہوں زمیں کا بیٹا ہوں
شکر ہے میں بہشت زادہ نہیں

.................

اسی تسلسل میں آپ کے افکار کچھ یوں بھی ہیں:

سحرؔ اپنی خطا اتنی ہے شاید
کہ دل کی بات کہہ دی دلبروں سے

.................

زندگی، جزا و سزا، عبادت، ریاضت اور حقیقی و ابدی سفر کے تعاقب میں بکھرے ہوئے نظریات کو انسان کی کاملیت اور پختگی کو ایک منفرد انداز سے پیش کیا ہے کہ پوری زندگی کا نچوڑ ایک شعر میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

کہاں ہر ایک کی قسمت میں ہے اجرِ عبادت بھی
جبینیں مل تو جاتی ہیں مگر سجدہ نہیں ملتا

.................

سحر انصاری کے اشعار میں انسانیت سے محبت، زمیں زادوں کی عظمت، محبت کی چاشنی۔ دنیا کی رنگینی، عصری رویے اور ایک حقیقی منزل کی تلاش میں ایک خاص ربط ہے۔ آپ کے کلام میں جو فکر انگیزی ملتی ہے وہ فارسی اور عربی کی لفظیات و تراکیب سے بھی بلند ہیں جیسے کہ ذیل کے اشعار:

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے
(میر تقی میر)

میر کے اس شعر میں عربی یا فارسی کا کوئی لفظی ترکیب استعمال نہیں ہوئی مگر اثر انگیزی کمال کی ہے اسی طرح مومن خان مومن کا شعر:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومن)

مومنؔ کا شعر سادگی، معنویت اور دل کشی کا ناقابلِ فراموش نمونہ آپ کے سامنے ہے؛ اسی انداز میں اگر پروفیسر سحر انصاری کے تصوف آمیز اشعار دیکھیں تو ایسے ایسے دل کش اشعار سامنے آتے ہیں جن پر بلاشبہ ناز کیا جا سکتا ہے:

ہم برزخ وفا کے جزا یافتوں کے پاس
اک جسم ہے سو جسم کی جنت نہیں کوئی

..................................

زیست کے ہر باب میں یوں بھی کیے فیصلے
جیسے خدا کے بغیر ہم بھی خدا ہی تو ہیں

..................................

ہم کو جنت کی فضا سے بھی زیادہ ہے عزیز
یہی بے رنگ سی دنیا، یہی بے مہر سے لوگ

..................................

جرم جو سب کے درمیان رہا
میرے اور رب کے درمیان رہا

..................................

پروفیسر سحر انصاری کی شخصیت، شاعری اور فکر و فن میں آپ کو کوئی بے جوڑ بندش، تخیل کی پستی اور فرومایگی، ابتذال و معنویت سے تہی دتی، التزام تالیف کا عدم احساس، روایت سے مکمل بغاوت، جدت اور تازگی کی کمی کا احساس، ندرت خیال کی کمی، حسن آرائی سے اجتناب، ہجر و وصال کا ذکر، سوز و گداز سے پہلوتہی، انسانیت سے محبت، مجازی و عشق حقیقی کا رنگ، ناصحانہ انداز یا پھر زبان و بیان سے عدم توجہی نہیں ملتی۔ یقیناً آپ کا یہ شاعرانہ انداز صوفیانہ انداز کے بالکل قریں معلوم ہوتا ہے کیونکہ صوفیانہ انداز میں یہی مضامین غالب رہتے ہیں آپ ایک کامل استاد ہیں آپ کی شخصیت پر آپ کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

فصیلِ شہر میں پیدا کیا ہے در میں نے
کسی بھی بابِ رعایت سے میں نہیں آیا

..................................

سحر انصاری کے تصوف آمیز شعروں میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مظاہر کی نشاندہی ہوتی ہے ایسی منکسر المزاج اور حلیم الطبع شخصیت کے کلام میں قدرت کے مناظر اور فطرت سے محبت زندہ ادب کی علامت ہے۔

پروفیسر سحر انصاری کا شعری و تنقیدی سرمایہ منفرد ہے، عشقِ حقیقی، عشقِ مجازی یا پھر عصری مسائل پر بھرپور توجہ نے ایک وسیع حلقہ بنالیا ہے جو سحر انصاری کے اشعار پر بھرپور انداز سے دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ آپ کے شعروں میں تصوف آمیز مضامین عصر کی موجودگی ایک نئی فکر سوچ کو جنم دیتی ہے اور فنی، شعوری اور فکری زاویے وا کرتی ہے۔ آپ کے شعری سفر میں کوئی جمود طاری نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی تھکن کے آثار۔ اس پیرانہ سالی میں بھی اپنی خوش مزاجی کو قائم رکھتے ہوئے بھرپور توانائی سے اردو ادب کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ وہ اپنے شعری سفر اور ادبی قد و قامت میں اپنے رب کے حضور یوں کلمات تشکر ادا کرتے ہیں:

کسی تیر سے، کسی سنگ سے، کسی زہر سے جو میں بچ گیا
تو یقین مجھ کو ہوا کہ کوئی دعا میرے ساتھ ہے

☆☆☆☆☆

# خالد احمد......غزل کے آئینے میں ایک عہد کی بازگشت

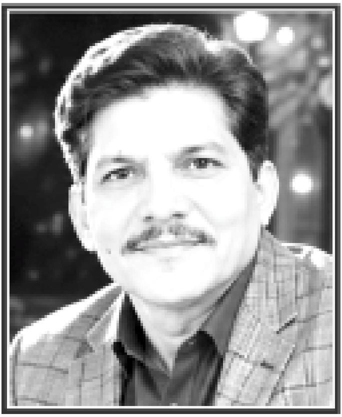

لکھنؤ اردو تہذیب اور ادب کی تاریخ میں محض ایک شہر کا نام نہیں، ایک پورا تہذیبی استعارہ ہے اس کی گلیوں میں زبان نے شائستگی سیکھی، گفتگو نے قرینِ اظہار پایا اور شعر نے انسانی احساسات کی نزاکتوں کو ایک خاص سلیقے کے ساتھ لفظوں میں ڈھالنا سیکھا میر، آتش، ناسخ اور انیس جیسے شعرا کی روایت سے روشن یہ شہر اردو کے مزاج میں ایک ایسی تہذیبی لطافت چھوڑ گیا جس کے اثرات نسلوں تک محسوس کیے جاتے رہے - اسی شہر میں 5 جون 1944 کو خالد احمد نے جنم لیا آگے چل کر انھوں نے اگرچہ لاہور کو اپنی زندگی کا مرکز بنایا مگر شاید لکھنؤ کی تہذیبی فضا کا کوئی نہ کوئی عکس ان کے شعری مزاج میں ہمیشہ موجود رہا تقسیمِ ہند کے بعد خالد احمد پاکستان آ گئے لاہور ان کی عملی اور ادبی زندگی کا مرکز بنا مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور سے میٹرک، دیال سنگھ کالج سے بی ایس سی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے فزکس میں ماسٹرز کی تعلیم حاصل کی عملی زندگی کا آغاز واپڈا میں انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے کیا اور ڈپٹی کنٹرولر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے یہ بات اپنی جگہ دلچسپ ہے کہ فزکس کا طالب علم آگے چل کر لفظ اور احساس کی دنیا میں اس طرح داخل ہوا کہ اس کی شاعری میں کائنات، انسان اور باطن کے سوالات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

خالد احمد کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے

ارشد محمود ارشد

تھا جہاں ادب محض شوق نہیں بل کہ زندگی کا ایک اہم حوالہ تھا خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور اور توصیف احمد خان سے ان کا خاندانی تعلق تھا جبکہ احمد ندیم قاسمی جیسے بزرگ ادیب سے قربت نے ان کے ادبی شعور کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ قاسمی صاحب سے ان کی وابستگی اور اثر پذیری کا عکس ان کے ہاں انسان دوستی اور سماجی احساس کی صورت میں دکھائی دیتا ہے تاہم خالد احمد کی شعری آواز اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔

روزنامہ ''امروز'' میں ''لحہ لحہ'' کے عنوان سے کالم لکھتے رہے جناب احمد ندیم قاسمی کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے ''فنون'' سے وابستہ رہے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے اور نغمے لکھے اور ماہنامہ ''بیاض'' بھی شائع کرتے رہے۔ ان کی تصانیف میں ''دراز پلکوں کے سائے سائے، ایک مٹھی ہوا، پہلی صدا پرندے کی، ہتھیلیوں پر چراغ، تشبیب، جدید تر پاکستانی ادب، نم گرفتہ اور کاجل گھر'' شامل ہیں۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں متعدد اعزازات ملے اور حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حسنِ کارکردگی سے بھی نوازا۔ مگر خالد احمد کو محض ان کی سوانح یا ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے یاد کرنا ان کی شخصیت اور فن دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان کی اصل شناخت ان کی شاعری ہے ایسی شاعری جس میں روایت اور جدید احساس ایک دوسرے سے متصادم نہیں بل کہ ایک دوسرے کو معنی عطا کرتے ہیں۔

ان کی غزل کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ ذاتی تجربے کو اجتماعی احساس میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے ہاں عشق ہے مگر عشق صرف محبوب کے حسن کا بیان نہیں، تنہائی ہے مگر وہ محض ذاتی تنہائی نہیں۔ شہر ہے مگر وہ محض عمارتوں اور سڑکوں کا شہر نہیں۔ ان سب کے پیچھے ایک ایسا انسان موجود ہے جو اپنے عہد، اپنے رشتوں اور اپنے وجود سے مسلسل سوال کرتا ہے

ربط کس سے تھا کسے کس کا شناسا کون تھا
شہر بھر تنہا تھا لیکن مجھ سا تنہا کون تھا

..............................................

یہ شعر خالد احمد کی شاعری کی ایک بنیادی کیفیت کو گرفت میں لے لیتا ہے شہر آباد ہے لوگ موجود ہیں رشتے بھی کہیں نہ کہیں موجود ہیں مگر انسان کے اندر ایک ایسا خلا ہے جسے ہجوم بھی پُر نہیں کر سکتا۔ یہ تنہائی محض عاشق کی تنہائی نہیں جدید انسان کی تنہائی ہے۔

اسی احساس کو وہ ایک اور شعر میں زیادہ وسیع تناظر دیتے ہیں:

پاؤں دھرتی پر تھے لیکن ذہن تھے آکاش پر
سب کے سب میری طرح بکھرے تھے یکجا کون تھا

..............................................

یہاں جسم اور ذہن، زمین اور آسمان، اجتماع

اور تنہائی ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ انسان بظاہر ایک جگہ موجود ہے مگر اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا ہے "بکھرے تھے یکجا" کی ترکیب پوری جدید انسانی صورتِ حال کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔

خالد احمد کے ہاں شہر ایک مستقل علامت ہے یہ شہر زندگی کی رونق کا استعارہ کم اور انسانی باطن کی پیچیدگی کا استعارہ زیادہ ہے:

اے دوست ترا شہر بھی ہے شہر طلسمات
چھو کر جسے دیکھا وہی پتھر نظر آیا

..............................

یہاں شہر طلسمات ہے جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ ویسا نہیں جیسا محسوس ہوتا ہے لمس حقیقت کی ضمانت نہیں رہا یہی کیفیت آگے بڑھ کر انسانی رویوں میں ظاہر ہوتی ہے

ہر شخص حقائق کی کڑی دھوپ کے ڈر سے
تانے ہوئے اوہام کی چادر نظر آیا

..............................

خالد احمد کے اندر کا شاعر اپنے عہد کی اس نفسیات کو محسوس کرتا ہے جس میں انسان حقیقت کا سامنا کرنے کے بجائے اپنے لیے ایک محفوظ وہمی دنیا تخلیق کر لیتا ہے "کڑی دھوپ" اور "اوہام کی چادر" کا تضاد اس شعر کو محض ایک خوب صورت تشبیہ نہیں رہنے دیتا بل کہ اسے ایک گہری سماجی معنویت عطا کرتا ہے۔

ان کے ہاں خواب بھی اسی طرح حقیقت سے متصادم ہو کر اپنا معنی پیدا کرتے ہیں:

میں خواب میں کل رات جسے چوم رہا تھا
جاگا تو اسی ہاتھ میں پتھر نظر آیا

..............................

اس شعر میں خواب کی نرمی اور بیداری کی سختی ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ جس شے کو خواب میں محبت کا استعارہ سمجھا گیا تھا بیداری میں وہی پتھر بن گئی۔ خالد احمد کے یہاں خواب کبھی فرار نہیں بل کہ حقیقت کو سمجھنے کا ایک دوسرا وسیلہ ہے اور بیداری اکثر اس خواب کی قیمت وصول کرتی ہے۔

عشق کے حوالے سے بھی خالد احمد کا رویہ روایتی ہوتے ہوئے روایتی نہیں رہتا۔ ان کے ہاں عشق جسمانی قربت سے آگے بڑھ کر ایک ایسی جمالیاتی اور روحانی کیفیت بن جاتا ہے جس میں محبوب کا لہجہ، خوشبو اور وجود سب ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں:

دم سادھ کے دیکھوں تجھے جھپکوں نہ پلک بھی
آنکھوں میں سمو لوں ترے لہجے کی دمک بھی

اور پھر کہتے ہیں:

اے عشق اگر مجھ کو ترا اذن ہو ممکن
آغوش میں لے لوں ترے پیکر کی مہک بھی

..............................

یہاں محبوب کو صرف دیکھا نہیں جا رہا سونگھا بھی جا رہا ہے لہجے کو سنا ہی نہیں جا رہا اس کی "دمک" بھی محسوس کی جا رہی ہے۔ حواس کا یہ باہمی امتزاج خالد احمد کے شعری اسلوب

کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کے ہاں لفظ محض معنی نہیں دیتا ایک حسی تجربہ بھی پیدا کرتا ہے۔
اسی غزل میں وہ کہتے ہیں کہ:

اے ذکر مرے فکر کی تقدیر بدل دے
اے نور مرے نطق کے کاسے میں جھلک بھی

..............................................

یہ شعر خالد احمد کے نزدیک شاعری کے منصب کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے ذکر اور فکر، نور اور نطق یہ سب مل کر ایک ایسے تخلیقی عمل کی تشکیل کرتے ہیں جس میں شاعر لفظ کے اندر روشنی تلاش کرتا ہے اس کے لیے شعر محض اظہار نہیں دریافت کا وسیلہ بھی ہے۔
خالد احمد کی شاعری میں انسان کا دکھ ذاتی حدود سے نکل کر اجتماعی صورت اختیار کرتا ہے ان کے ہاں جوان لاشیں ہیں، مائیں ہیں، شہر ہیں، خوف ہے، شکست ہے اور ایک ایسی دنیا ہے جہاں انسان کو اپنی انسانیت بچانے کی فکر ہے:

کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں سے
اسی لیے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

..............................................

اس شعر میں المیہ براہِ راست بیان نہیں ہوا مگر اس کی شدت پوری طرح محسوس ہوتی ہے۔ شاعر واقعے کی تفصیل نہیں دیتا وہ انسانی رشتے کے ایک بنیادی منظر، ماں اور بیٹے کے ذریعے پوری تاریخ کا دکھ سامنے لے آتا ہے۔
شاید اسی انسانی شعور کی انتہا اس دعا میں ملتی ہے:

مرے حالات مجھ کو چھو نہ پائیں
مجھے ہر حال میں انسان رکھنا

..............................................

یہاں خالد احمد کا شاعر کسی بڑی کامیابی یا غیر معمولی مرتبے کا طالب نہیں۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں اس کے اندر کا انسان محفوظ رہے یہی وہ مقام ہے جہاں ان کی شاعری محض جمالیاتی تجربہ نہیں رہتی بلکہ ایک اخلاقی حس بھی اختیار کر لیتی ہے۔
ان کی شاعری میں روحانی تجربہ بھی اسی انسانی سطح سے ابھرتا ہے۔ ان کی دعا میں حیرت کی خواہش خاص طور پر قابلِ توجہ ہے:

کھلا مجھ پر درِ امکان رکھنا
مرے مولا مجھے حیران رکھنا

..............................................

عام طور پر انسان حیرت سے نجات چاہتا ہے خالد احمد حیرت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ حیرت ختم ہو جائے تو سوال ختم ہو جاتے ہیں اور سوال ختم ہوں تو تخلیق بھی کہیں نہ کہیں رک جاتی ہے۔
"درِامکان" کھلا رہنا اسی تخلیقی اور روحانی جستجو کی علامت ہے۔
اسی دعا میں ایک اور شعر ہے کہ:

مرے دل کا ورق نکلے نہ سادہ
کوئی خواہش کوئی ارمان رکھنا

..............................

یہاں خواہش اور ارمان زندگی کی علامت بن جاتے ہیں۔ شاعر دل کے ورق کو خالی نہیں دیکھنا چاہتا۔ زندگی کی معنویت شاید اسی میں ہے کہ انسان کے اندر کچھ چاہنے کچھ پانے اور کچھ تلاش کرنے کی خواہش باقی رہے۔

خالد احمد اپنی شناخت کے بارے میں بھی ایک دلچسپ شعور رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں:

مجھے بھی عام یا گمنام کر دے
کہ اک آزار ہے پہچان رکھنا

..............................

ادبی دنیا میں پہچان حاصل کرنا آسان نہیں مگر پہچان کے ساتھ ایک بوجھ بھی آتا ہے شاعر اس بوجھ سے آگاہ ہے یہ شعر شہرت سے فرار کی خواہش کم اور شناخت کے پیچیدہ نفسیاتی اثرات کا اعتراف زیادہ ہے۔

ان کی شاعری میں وقت اور فنا کا احساس بھی مسلسل موجود ہے۔ خاک، ڈھیریاں، آئینہ، کرچیاں، قہقہے اور پیالیاں جیسی معمولی چیزیں ان کے ہاں وقت کے گزرنے کی علامت بن جاتی ہیں وہ کہتے ہیں:

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اٹھ گئے نیکیاں رہ گئیں

..............................

یہ شعر اپنی سادگی ہی میں بہت گہرا ہے آدمی چلے جاتے ہیں مگر ان کے اعمال باقی رہ جاتے ہیں۔ موت جسم کو ختم کرتی ہے اثر کو نہیں۔

اسی غزل میں ایک اور منظر دیکھیے:

قمقموں کی طرح قہقہے جل بجھے
میز پر چائے کی پیالیاں رہ گئیں

..............................

کسی محفل کے ختم ہو جانے کا یہ معمولی سا منظر اچانک پوری زندگی کا استعارہ بن جاتا ہے لوگ چلے گئے قہقہے بجھ گئے مگر پیالیاں رہ گئیں۔ انسان کے گزر جانے کے بعد باقی رہ جانے والی چیزیں کس طرح یاد کا حصہ بن جاتی ہیں خالد احمد اس معمولی منظر کو غیر معمولی معنویت دے دیتے ہیں۔

ان کی غزل میں فن اور فن کار کی اپنی ذات بھی موضوع بنتی ہے:

بے وفا ہوں نہ وفادار ہوں میں
سچ تو یہ ہے کہ اداکار ہوں میں

..............................

یہ اعتراف بظاہر سادہ ہے مگر اس کے اندر ایک پیچیدہ انسانی حقیقت چھپی ہے۔ انسان زندگی کے مختلف مرحلوں میں مختلف کردار ادا کرتا ہے اور کبھی کبھی کردار اور اصل ذات کے درمیان فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔

اسی غزل میں شاعر کہتا ہے:

میرے ہاتھوں میں گڑے ہیں کانٹے
پھول بھوں اور سر دار ہوں میں

یہاں حسن اور اذیت، پھول اور دار، نرمی اور تشدد ایک ہی شعری منظر میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہی تضاد خالد احمد کی شاعری کا ایک اہم جمالیاتی وصف ہے۔
وہ درد کو بھی اسی طرح دیکھتے ہیں۔ درد ان کے ہاں صرف شکایت نہیں، تخلیقی تجربہ ہے:

درد انگور کی بیل تھے پھل گئے
غم کشوں کے لیے تلخیاں رہ گئیں

..............................

درد کا بیل، بننا اور پھر اس کا پھل جانا ایک ایسا استعارہ ہے جو بتاتا ہے کہ وقت کے ساتھ دکھ ختم نہیں ہوتا اپنی ایک نئی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی وہ یاد بن جاتا ہے، کبھی شعر اور کبھی انسان کے مزاج کا حصہ----
خالد احمد کی زبان میں کلاسیکی غزل کا حسن بھی ہے اور جدید تجربے کی بے قراری بھی۔ وہ مشکل بات کو لازماً مشکل زبان میں بیان نہیں کرتے ان کے کئی اشعار اپنی سادگی میں دیر تک ساتھ رہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ:

لب سیے دیکھا کروں سوچا کروں
میرے بس میں کچھ نہیں میں کیا کروں

اور پھر کہتے ہیں:

شہر کے شور و شغب سے بھاگ کر
کوئی کنجِ عافیت ڈھونڈا کروں

..............................

یہاں شاعر کا مسئلہ محض باہر کے شور سے نجات نہیں، اندر کے شور سے بھی ہے۔ شہر سے فرار ممکن ہے مگر اپنے باطن سے فرار کہاں؟
اسی لیے وہ آگے کہتے ہیں کہ:

اور جب اپنی سمجھ میں کچھ نہ آئے
چیخ اٹھوں کیا کروں میں کیا کروں

..............................

یہ تکرار محض لفظی تکرار نہیں۔ ''کیا کروں'' کی بازگشت اس بے بسی کو صوتی شکل دے دیتی ہے جس سے جدید انسان گزرتا ہے۔
خالد احمد کی شاعری میں ایک طرف یہ بے بسی ہے اور دوسری طرف مسلسل جستجو بھی---وہ مکمل یقین کے شاعر نہیں، سوال کے شاعر ہیں۔ وہ منزل سے زیادہ سفر کے شاعر ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں حیرت، امکان، خواب، تنہائی، شہر اور انسان بار بار نئے معنوں میں واپس آتے ہیں۔
جناب خالد احمد سے میری پہلی اور آخری ملاقات 2009 میں ہوئی، جب میرے دوسرے شعری مجموعے کبھی میں یاد آؤں تو--- کی تقریب رونمائی محترمہ فوزیہ مغل نے ادبی بیٹھک، الحمرا لاہور میں منعقد کی تھی۔ میرا کلام بیاض میں تواتر سے شائع ہو رہا تھا اس لیے جناب خالد احمد سے غائبانہ تعارف پہلے سے تھا یہ بالمشافہ ملاقات اگرچہ مختصر تھی مگر ان کی شخصیت کا تاثر دیر تک قائم رہا۔ وہ انتہائی نفیس، سادہ طبیعت اور شائستہ مزاج انسان تھے۔
''بیاض'' کے حوالے سے ان کا تعلق بھی

میرے لیے اس ملاقات کو مزید معنی خیز بناتا ہے۔ وہ ان ادیبوں میں سے تھے جو نئی آوازوں کو محض سننا نہیں چاہتے تھے بل کہ ان کے لیے ادبی فضا بھی بناتے تھے۔ ادب میں ایسے لوگ کسی ادارے یا عہدے سے نہیں، اپنے رویے سے اہم ہوتے ہیں۔ خالد احمد بھی اسی معنی میں ایک ادبی چشمہ تھے جس سے بہت سے مسافرانِ ادب نے فیض پایا۔

19 مارچ 2013 کو لاہور میں خالد احمد کی وفات کے ساتھ اردو ادب نے ایک حساس شاعر، کالم نگار اور ادبی شخصیت کو کھو دیا، مگر شاعر کی اصل زندگی اس کے بعد شروع ہوتی ہے جب اس کا وجود اس کے لفظوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ خالد احمد بھی اپنے لفظوں میں موجود ہیں کبھی ایک تنہا شخص کی صورت میں، کبھی شہر کی گلیوں میں بھٹکتے ہوئے، کبھی محبوب کے لہجے کی دمک میں، کبھی کسی جوان لاش پر جھکتی ہوئی ماں کے آنسو میں اور کبھی اپنے مولا سے انسان رہنے کی دعا کرتے ہوئے۔

ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد سے فرار اختیار نہیں کرتے۔ وہ اس کے دکھ، اس کی الجھن، اس کے خواب اور اس کی شکست کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور پھر اسے غزل کے نرم مگر گہرے لہجے میں واپس کرتے ہیں۔ ان کے ہاں لفظ چیختا کم ہے دیر تک گونجتا زیادہ ہے۔ شاید اسی لیے خالد احمد کی شاعری کو صرف ایک شاعر کی شاعری کہنا کافی نہیں۔ یہ ایک ایسے عہد کی بازگشت ہے جس میں انسان ہجوم میں تنہا تھا حقیقت کے سامنے حیران تھا خوابوں میں پناہ ڈھونڈتا تھا اور پھر بھی اپنے اندر انسان کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جناب خالد احمد کی اصل میراث یہی کوشش ہے۔ لفظ کے ذریعے انسان کو سمجھنے کی کوشش، دکھ کو معنی دینے کی کوشش اور حالات کی سختی کے باوجود انسان رہنے کی کوشش۔ ان کے اپنے الفاظ میں دیکھیں:

مرے حالات مجھ کو چھو نہ پائیں
مجھے ہر حال میں انسان رکھنا

.................................................

یہ دعا خالد احمد کے بعد بھی باقی ہے۔ شاید یہی ان کی شاعری کا سب سے روشن چراغ ہے۔

جناب خالد احمد نے ،، بیاض،، کی صورت میں جو پودا لگایا گو کہ وہ ان کی حیات میں ہی تناور شجر کا روپ دھار چکا تھا مگر ان کی وفات کے بعد جناب عمران منظور اور جناب نعمان منظور نے اسے مرجھانے نہیں دیا اور اس کی آبیاری اپنے تن من دھن سے کی۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ کرے بیاض کی کی یہ گھنی چھاؤں اسی طرح مسافرانِ ادب کو میسر رہے۔

☆☆☆☆☆

# نصیر احمد ناصر کی ایک معرکۃ الآرا نظم: "بارش اچانک تیز ہو گئی ہے" کا تجزیاتی مطالعہ

نصیر احمد ناصر جدید اردو نظم کے نمایاں شاعر ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو کر شہرت کے بام عروج پر پہنچ چکے ہیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں شامل ہیں:

پانی میں گم خواب (نظموں کا مجموعہ)

عرابچی سو گیا ہے (نظموں کا مجموعہ)

ملبے سے ملی چیزیں (نظموں کا مجموعہ)

زرد پتوں کی شال (مختصر نظموں کا مجموعہ)

تیسرے قدم کا خمیازہ (نثری نظموں کا مجموعہ)

سرمئی نیند کی بازگشت (نثری نظموں کا مجموعہ)

بارش اچانک تیز ہو گئی ہے (نثری نظموں کا مجموعہ، زیر طبع)

ان کی کچھ کتابوں کے غیر ملکی زبانوں (انگریزی، عربی وغیرہ) میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔

نظم دیکھیے!

## بارش اچانک تیز ہو گئی ہے

"تمھیں اُن خطوں کے ملنے کی امید ہے
جو کبھی پوسٹ نہیں کیے گئے
اور میں وہ نظمیں چھپتا رہتا ہوں
جو کبھی لکھی نہیں جائیں گی
ہم دونوں
ایک طوالت پذیر خواب کی واماندگی میں
ایک دوسرے کی آنکھوں میں جاگ رہے ہیں
اور اس خواب سے باہر
طلوع و غروب کا کھیل جاری ہے

دن اور زمانہ کوئی بھی ہو
محبت کرنے والوں کے لیے رک کر نہیں دیکھتا
کچھ دن طلوع ہونے سے پہلے غروب ہو جاتے ہیں
اور کچھ محبتیں پروان چڑھے بغیر ختم ہو جاتی ہیں
جیسے کچھ خط لکھے بغیر پوسٹ کر دیے جاتے ہیں
اور کچھ لکھے پڑے رہ جاتے ہیں
او سیپوف کی طرح

عمروں کی نارسائی میں
یہ سوچنا بے مائگی ہے
کہ کون، کب اور کیسے ملے یا بچھڑے گا

ظہیر گیلانی

یا ملے بغیر جدا ہو جائے گا
جب تم کہاں تھے
جب میں زندگی کے اداس ترین دنوں سے
گزر رہا تھا
میرے پاس اَن دیکھے خوابوں کا ذخیرہ ختم ہو
چکا تھا
اور جینے کے لیے چٹکی بھر محبت بھی دستیاب
نہیں تھی
اور سانس لینے کے لیے
چھت کے پنکھوں اور درختوں کے نیچے کھڑا
ہونا پڑتا تھا
اور اب تم کہاں ہو؟
جب شاعری سرِ عام رسوا ہو رہی ہے
اور نظموں سے فلرٹ کیا جا رہا ہے
آرٹ صرف فلموں
یا نیم برہنہ جسموں میں رہ گیا ہے
میں پھر بھی کہوں گا
تمہارے کھتئی بالوں کا گھونسلا، اٹھی ہوئی
لمبی گردن کے تل
اور ڈھکے ہوئے سینے کے ابھار
میری نظموں سے زیادہ خوبصورت ہیں
ہاں اگر تم خود نظم لکھو
تو شاید اس کی رعنائی کا مقابلہ نہ کر سکو
دیوار پہ بیٹھا پرندہ بھی جانتا ہے
ہلکی بارش اور در پردہ محبت میں کیا
مشترک ہے
ایک باہر سے بھگو دیتی ہے
دوسری اندر سے

بارش اچانک تیز ہو گئی ہے
اور میں لان سے اٹھ کر لاؤنج میں
آ گیا ہوں
پلاسٹک کی میز اور کرسیاں نم گیر نہیں ہوتیں
ان پہ گرنے والے قطرے گرتے ہی بلبلے
بن جاتے ہیں
میں نادیدہ آنکھ سے دیکھ رہا ہوں
تم اِس وقت موبائل ہاتھ میں تھامے بستر پر
نیم دراز ہو
اور اسکرین پر ایپائی اک تارا نچ رہا ہے
کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ جاؤ
چھینٹے اڑاتی ہوا اور بھیگے ہوئے خالی کاغذ
کے پرزے
تمہاری نظم بننے کے لیے تیار ہیں!"

..............................

نصیر احمد ناصر کی نظم "بارش اچانک تیز ہو گئی ہے" ان کی زیرِ طبع کتاب 2022 میں شامل ہے۔ کتاب کا نام بھی وہی ہے جو نظم کا عنوان ہے۔ یہ عنوان ایک طرف تو بہت معصومانہ اور رومانوی ہے تو دوسری طرف قاری کی توجہ کھینچ لینے والا اور ادبی فکر کو

انگیخت کرنے والا ہے۔
نصیر احمد ناصر صاحب کی نظم "بارش اچانک تیز ہوگئی ہے" میں بارش کا اچانک تیز ہو جانا محض ایک موسمی تبدیلی یا قدرتی منظر نہیں ہے، بل کہ یہ داخلی، حسی اور فکری سطح پر گہری علامتی اور استعاراتی تہیں رکھتا ہے۔ ایک حساس شاعر کے لیے بارش کا تیز ہونا خیالات کی اس امڈتی ہوئی لہر کی علامت بھی ہے جو اتنی شدید ہے کہ اسے الفاظ کے سانچے میں ڈھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ ان ناتمام تحریروں اور ضائع شدہ الفاظ کے ملال کو بڑھا دیتا ہے جو وقت کی بے حسی کی نذر ہوگئے (جیسے اوسیپوف کی تحریریں)۔ بارش تو ہو رہی تھی لیکن اس میں اچانک تیزی آجانا، احساسات و محسوسات میں تیزی، جذباتی طوفان میں شدت، یادوں کے ہجوم کی یلغار اور داخلی تلاطم یعنی اندرونی بے چینی میں ایک دم اضافہ کا سبب بن سکتے ہے۔
اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم نظم "بارش اچانک تیز ہوگئی ہے" کو پڑھتے ہیں تو بادی النظر میں یہ نظم ایک غائب محبوب سے مکالمہ محسوس ہوتی ہے، لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھیں تو اپنی معنوی تہوں میں یہ محبت، وقت، انسانی نارسائی، تخلیقی تنہائی اور ہمارے عہد میں شاعری کی صورتِ حال کا گہرا مطالعہ بن کر ابھرتی ہے۔ نظم کا بنیادی تجربہ محض جدائی نہیں، بل کہ ان امکانات کا ضائع ہو جانا ہے جو حقیقت بننے سے پہلے ہی وقت کی دسترس میں آجاتے ہیں: وہ خط جو پوسٹ نہ ہو سکے، وہ نظمیں جو کبھی لکھی نہ گئیں، وہ دن جو طلوع ہونے سے پہلے غروب ہو جائیں اور وہ محبتیں جو پروان چڑھے بغیر ختم ہو جائیں۔ نظم کا آغاز ایک نہایت بلیغ تضاد سے ہوتا ہے:

تمھیں اُن خطوں کے ملنے کی امید ہے
جو کبھی پوسٹ نہیں کیے گئے
اور میں وہ نظمیں بھیجتا رہتا ہوں
جو کبھی لکھی نہیں جائیں گی

---

خط لکھے جا چکے ہیں مگر بھیجے نہیں جا سکے، جب کہ نظمیں لکھی ہی نہیں گئیں مگر مسلسل بھیجی جا رہی ہیں۔ یہ منطقی ناممکنات دراصل دونوں کرداروں کے درمیان موجود ایک ایسے باطنی رابطے کو ظاہر کرتی ہیں جسے ظاہری اظہار نصیب نہیں ہو سکا۔ یہاں خط اور نظم باہم بدلتی ہوئی علامتیں ہیں خط نجی محبت کا اظہار ہے اور نظم اسی نجی تجربے کی تخلیقی صورت۔ یوں خود یہ نظم ایک ایسے خط

کی مانند محسوس ہوتی ہے جو بیک وقت ارسال بھی ہوا ہے اور نہیں بھی ہوا۔

''ایک طوالت پذیر خواب کی واماندگی'' میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جاگنے کا پیکر بھی غیر معمولی ہے۔ خواب عموماً نیند سے وابستہ ہے، لیکن یہاں دونوں کردار خواب کے اندر بیدار ہیں۔ وہ جسمانی طور پر ایک دوسرے کے پاس نہیں، مگر ایک دوسرے کے شعور میں زندہ ہیں۔ اس داخلی وقت کے مقابل نظم کے باہر ''طلوع و غروب کا کھیل'' جاری ہے ۔ کائنات کی گردش انسانی محبت، انتظار اور محرومی سے بے نیاز ہے۔ اسی لیے کچھ دن شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جاتے ہیں اور کچھ محبتیں اپنا نام اور مکمل صورت پانے سے پہلے ہی معدوم ہو جاتی ہیں۔

''ملے بغیر جدا ہو جائے گا'' نظم کا ایک نہایت فکرانگیز امکان ہے۔ روایتی تصور میں جدائی ملاقات کے بعد واقع ہوتی ہے، مگر یہاں دو انسان ایک دوسرے کے خواب، خیال یا ممکنہ وجود سے اس قدر وابستہ ہو سکتے ہیں کہ حقیقی ملاقات کے بغیر بھی جدائی ان کا مقدر بن جائے ۔ یہی ''عمروں کی نارسائی'' ہے۔ انسانی عمر اپنے تمام ممکنہ رشتوں، خوابوں اور ملاقاتوں کے لیے ناکافی ثابت ہوتی ہے۔

نظم کے وسط میں شاعر کی وجودی محرومی نہایت جسمانی صورت اختیار کر لیتی ہے:

میرے پاس اَن دیکھے خوابوں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا\
اور جینے کے لیے چٹکی بھر محبت بھی دستیاب نہیں تھی

خوابوں کو ''ذخیرے'' اور محبت کو ''چٹکی بھر'' ضروری شے کے طور پر پیش کرنا جذباتی کیفیات کو روزمرہ زندگی کی مادی زبان میں منتقل کر دیتا ہے۔ پھر سانس لینے کے لیے چھت کے پنکھوں اور درختوں کے نیچے کھڑے ہونے کی تصویر اداسی کو محض ذہنی کیفیت نہیں رہنے دیتی؛ وہ گھٹن اور سانس کی تنگی کی صورت جسم میں اتر آتی ہے۔

''تب تم کہاں تھے؟'' کے بعد ''اور اب تم کہاں ہو؟'' نظم کے نجی شکوے کو تہذیبی اور ادبی احتجاج میں بدل دیتا ہے۔ نصیر احمد ناصر معاصر ادب سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ ان کے نزدیک شاعری ''سرِ عام رسوا'' ہو رہی ہے۔ نظموں سے رومانوی کھلواڑ اور ''فلرٹ'' کیا جا رہا ہے۔ یہاں فلرٹ سطحی، عارضی اور ذمہ داری سے خالی دل چسپی کا استعارہ ہے ۔ سچی محبت کی طرح سچی شاعری بھی داخلی وابستگی، ریاضت اور

وفاداری چاہتی ہے: اسے محض نمائش، فوری تاثر یا دل لگی بنا دینا شاعر کے نزدیک اس کی توہین ہے۔

آرٹ اور نیم برہنہ جسموں کے ذکر کے فوراً بعد محبوب کے جسمانی حسن، گھنگھریالے بالوں، گردن کے تل اور ڈھکے ہوئے سینے کے ابھار کی تعریف بظاہر ایک تضاد پیدا کرتی ہے، مگر اسی تضاد میں نظم کا جمالیاتی موقف پوشیدہ ہے۔ مسئلہ جسم یا حسن نہیں، بل کہ حسن کا نمائشی اور بازاری استعمال ہے۔ محبوب کا جسم شاعر کے لیے کوئی بے نام شے نہیں بل کہ یاد، قربت اور شناخت کا حامل زندہ وجود ہے۔ ''گھنگھریالے بالوں کا گھونسلا'' محض ظاہری حسن کا پیکر نہیں؛ گھونسلا گھر، پناہ، حرارت اور زندگی کی علامت بھی ہے۔

نظم کا معنوی مرکز ان سطروں میں مرتکز ہو جاتا ہے:

''ہلکی بارش اور در پردہ محبت میں کیا مشترک ہے
ایک باہر سے بھگو دیتی ہے
دوسری اندر سے''

بارش اور محبت دونوں کا اثر ''بھگونا'' ہے، مگر دونوں کی سمت مختلف ہے۔ بارش جسم اور سطح کو تر کرتی ہے، جب کہ پوشیدہ محبت حافظے، احساس اور روح میں نفوذ کرتی ہے۔

''دیوار پہ بیٹھا پرندہ'' اس راز کا گواہ ہے۔ دیوار فاصلے اور حد کی علامت ہے، جب کہ پرندہ ان حدود سے نسبتاً آزاد فطری شعور کا نمائندہ ہے۔ جس حقیقت کو انسان چھپاتا اور پیچیدہ بناتا ہے، پرندہ اسے فطری طور پر جانتا ہے۔

''بارش اچانک تیز ہو جاتی ہے'' کی تکرار پر نظم تجریدی فکر سے ایک ٹھوس گھریلو منظر میں داخل ہو جاتی ہے۔ لان، لاؤنج، پلاسٹک کی میز و کرسیاں اور ان پر بنتے بلبلے جدید شہری زندگی کی عام اشیا ہیں، مگر نصیر احمد ناصر کا فن انھیں معنی خیز علامتوں میں بدل دیتا ہے۔ پلاسٹک پانی کو جذب نہیں کرتا؛ قطرے اس کی سطح پر بلبلے بن کر مٹ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس حساس انسان محبت سے اندر تک بھیگ جاتا ہے۔ بلبلے ان مختصر دنوں، ناتمام محبتوں اور عارضی امکانات کی یاد بھی دلاتے ہیں جو لمحہ بھر صورت بناتے اور پھر تحلیل ہو جاتے ہیں۔

خط سے موبائل اور کاغذ سے اسکرین تک کا سفر نظم کو ہمارے عہد سے جوڑتا ہے۔ فوری رابطے کے تمام وسائل موجود ہونے

کے باوجود دونوں کرداروں کے درمیان حقیقی مکالمہ قائم نہیں ہو پاتا۔ ٹیکنالوجی پیغام کی رفتار بڑھا سکتی ہے، لیکن انسانی فاصلے اور نارسائی کو لازماً ختم نہیں کرتی۔

شاعر ''نادیدہ آنکھ'' سے محبوب کو موبائل تھامے، بستر پر نیم دراز اور ایرانی موسیقی سنتے ہوئے دیکھتا ہے۔ یہ آنکھ جسمانی نہیں بل کہ محبت، یاد اور شاعرانہ وجدان کی آنکھ ہے۔

نظم کا اختتام مایوسی پر نہیں بل کہ تخلیقی امکان پر ہوتا ہے:

''کمرے سے نکل کر برآمدے میں آجاؤ
چھینٹے اڑاتی ہوا اور بھیگے ہوئے خالی کاغذ کے پرزے
تمھاری نظم بننے کے لیے تیار ہیں!''

ابتدا میں وہ نظمیں تھیں جو کبھی لکھی نہیں جائیں گی؛ اختتام پر خالی کاغذ نظم بننے کے لیے تیار ہے۔ کمرے سے برآمدے میں آنے کی دعوت بھی اہم ہے۔ کمرہ مکمل باطن، لان مکمل خارج اور برآمدہ دونوں کے درمیان ایک سرحدی مقام ہے۔ یہی نظم کی محبت کی جگہ بھی ہے؛ اظہار اور اخفا، قرب اور فاصلے، ملاقات اور جدائی کے درمیان۔ بھیگا ہوا کاغذ بظاہر لکھنے کے قابل نہیں، مگر شاعر اسے تخلیق کے لیے تیار سمجھتا ہے؛ گویا حقیقی نظم صرف سیاہی سے نہیں، بھیگے ہوئے تجربے سے بھی لکھی جا سکتی ہے۔

نصیر احمد ناصر کی نظم کی بڑی خوبی اس کی مکالماتی روانی، تازہ پیکر تراشی اور معنوی ربط ہے۔ ''پوسٹ''، ''فلرٹ''، ''لاؤنج''، ''پلاسٹک''، ''موبائل'' اور ''اسکرین'' جیسے معاصر الفاظ اسے کسی غیر معین رومانوی ماضی کے بجائے موجودہ عہد کی محبت اور تنہائی کی نظم بناتے ہیں۔ بعض مقامات پر آرٹ اور شاعری کے زوال سے متعلق بیانات قدرے خطیبانہ اور کلی (Sweeping Statements) محسوس ہوتے ہیں، مگر یہ سادہ اور براہ راست انداز ایک زخمی اور حساس شاعر کے لہجے سے ہم آہنگ ہے۔

مجموعی طور پر ''بارش اچانک تیز ہو گئی ہے'' ایسی محبت کی نظم ہے جس کا اصل المیہ وصل کے بعد کی جدائی نہیں بل کہ امکان کا وقوع پذیر نہ ہو سکنا ہے۔ اس میں خط لکھے جانے سے پہلے معنی رکھتے ہیں، نظمیں وجود میں آنے سے پہلے سفر کرتی ہیں اور لوگ ملے بغیر بھی ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں۔ تاہم آخری منظر یہ امید باقی

رکھتا ہے کہ جب انسان محفوظ کمرے سے نکل کر بارش کے چھینٹوں کے قریب آئے گا تو شاید وہ نظم، جو کبھی لکھی نہیں جاتی تھی، بھیگے ہوئے خالی کاغذ پر لکھی جا سکے گی۔ یہی تخلیقی امکان اس نظم کی سب سے گہری اور دیرپا روشنی ہے۔

نظم کی عصری معنویت:

نصیر احمد ناصر کی نظم ''بارش اچانک تیز ہو گئی ہے'' معاصر عالمی شاعری کے اس رجحان سے بامعنی مکالمہ کرتی ہے جس میں شخصی تجربہ، منتشر زمانی شعور اور اظہار کی نامکمل صورتیں ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ نظم کا آغاز ہی ترسیل کے ایک ناممکن تبادلے سے ہوتا ہے: محبوب ان خطوں کا منتظر ہے جو کبھی پوسٹ نہیں کیے گئے، جبکہ شاعر وہ نظمیں بھیجتا ہے جو کبھی لکھی نہیں جائیں گی۔ یہاں محبت صرف دو انسانوں کا تعلق نہیں، ان امکانات کا تعلق بھی ہے جو وجود میں آنے سے پہلے انتظار، یادداشت اور محرومی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ صورت معاصر شاعری کے ایلیپٹیکل، یعنی حذف و تعلیق پر قائم انداز سے تقابل کی گنجائش پیدا کرتی ہے، جس میں تجربے کی تمام کڑیاں فراہم کیے بغیر شخصی آواز اور معنوی خلا ساتھ رکھے جاتے ہیں۔ ناصر کے ہاں یہ خلا جذباتی ربط کو توڑتا نہیں، اسے مزید گہرا کرتا ہے۔

''ایک دوسرے کی آنکھوں میں جاگ رہے ہیں'' قربت کا نہایت لطیف پیکر ہے، مگر یہ بیداری ایک ''طوالت پذیر خواب کی واماندگی'' کے اندر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ یوں محبت کی بیداری اور خواب کی تھکن ایک ساتھ موجود ہیں، جبکہ باہر طلوع و غروب کا جاری کھیل انسانی احساس سے بے نیاز وقت کی حرکت بن جاتا ہے۔

وقت کی یہی بے نیازی اگلے حصے میں محبت اور زندگی کی نامکمل صورتوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہے۔ ''کچھ دن طلوع ہونے سے پہلے غروب ہو جاتے ہیں'' محض ایک خوب صورت متناقض بیان نہیں؛ یہ ان زندگیوں، فرصتوں اور تعلقات کا تجربہ ہے جنھیں اپنی پوری صورت اختیار کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ نظم ملاقات کے ساتھ ''بغیر جدا'' ہونے کو بھی انسانی رشتے کی ممکنہ حقیقت تسلیم کرتی ہے، اور اس طرح محبت کے روایتی قصے کی ابتدا، وصال اور اختتام کی ترتیب بدل دیتی ہے۔ تاہم یہ زمانی پیچیدگی فوراً ایک شدید شخصی سوال میں سمٹ آتی ہے:

''تب تم کہاں تھے'' اور ''اب تم کہاں ہو؟''

ان دونوں سوالوں کے درمیان ماضی کی

تنہائی اور حال کی غیر موجودگی ایک دوسرے کی گونج بن جاتی ہیں۔ ”چٹکی بھر محبت“ میں ایک معمولی گھریلو پیمانہ زندگی کی بنیادی ضرورت کو ناپنے لگتا ہے، جبکہ پنکھوں اور درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر سانس لینے کی تصویر ذہنی کرب کو جسمانی تجربے میں منتقل کرتی ہے۔ یہاں ناصر کی قوت یہ ہے کہ پیچیدہ وجودی کیفیت کو روزمرہ اشیا اور عام بول چال سے ایسی شدت دیتے ہیں کہ فلسفیانہ مفہوم محسوس ہونے والی زندگی بن جاتا ہے۔

اس داخلی کرب سے نظم شاعری اور آرٹ کی معاصر صورتِ حال کی طرف مڑتی ہے، اور محبت کا خطاب خود تخلیق کے بارے میں سوال اٹھانے لگتا ہے۔ ”شاعری سرِ عام رسوا ہو رہی ہے“ اور ”نظموں سے فلرٹ کیا جا رہا ہے“ میں فن کے ساتھ سرسری، نمائشی اور غیر ذمہ دار تعلق پر اعتراض سنائی دیتا ہے۔ یہ اعتراض اس عالمی ادبی بحث سے نسبت رکھتا ہے جس میں شاعری کے تجرباتی انقطاع کے باوجود اس کی جذباتی رسائی اور انسانی اہمیت کا سوال برقرار رہتا ہے۔ لیکن ناصر کی نظم محض شکایت پر نہیں ٹھہرتی؛ وہ اپنے ہی دعوے کے اندر ایک معنی خیز تناؤ پیدا کرتی ہے۔ آرٹ کے جسمانی نمائش تک محدود ہونے پر اعتراض کے بعد شاعر محبوب کے بالوں، گردن کے تل اور سینے کی صورت کو اپنی نظموں سے زیادہ خوب صورت قرار دیتا ہے۔ یوں جسم، جمال اور فن کا تعلق یک رخے اخلاقی فیصلے سے زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ پھر ”ہاں اگر تم خود نظم لکھو“ محبوب کو دیکھے جانے والے وجود سے تخلیق کرنے والے وجود کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اس موڑ پر نظم کی جمالیات میں اہم تبدیلی آتی ہے: محبوب کی اہمیت اس کی خوب صورتی کے ساتھ اس کی تخلیقی قدرت سے بھی وابستہ ہو جاتی ہے۔

تخلیقی قدرت کا یہی امکان بارش، پرندے اور روزمرہ اشیا کے ذریعے پوری خارجی دنیا میں پھیلنے لگتا ہے۔ ”ہلکی بارش اور در پردہ محبت“ کا تقابل اندر اور باہر کی سرحد قائم بھی کرتا ہے اور دونوں کو ایک مشترک تجربے میں جوڑ بھی دیتا ہے: ایک جسم کو بھگوتی ہے، دوسری باطن کو۔ یہاں فطرت محض محبوب کی یاد کا پس منظر نہیں؛ وہ احساس کو سمجھنے اور نظم کی حرکت بدلنے میں حصہ لیتی ہے۔ معاصر ماحولیاتی شعریات بھی ماحول کو فعال موضوع کے

طور پر دیکھنے پر زور دیتی ہے؛ ناصر کی نظم اس زاویے سے تقابل کی گنجائش رکھتی ہے، اگرچہ اسے باقاعدہ ماحولیاتی بحران کی نظم کہنا درست نہیں ہوگا۔ بارش اچانک تیز ہوتی ہے تو شاعر کی جگہ، منظر اور توجہ بدل جاتے ہیں۔ لان سے لاونج تک یہ معمولی حرکت نظم میں ایک منظر سے دوسرے منظر کی منتقلی کا کام کرتی ہے۔ پلاسٹک کی میز اور کرسیاں پانی کو جذب نہیں کرتیں، جبکہ نظم کے آغاز سے انسانی باطن احساس میں بھیگ رہا ہے؛ اس تقابل سے سطح پر ٹھہرنے اور اندر اترنے کا فرق ابھرتا ہے۔ پھر موبائل کی اسکرین پر ایرانی موسیقی کا ذکر ایک مقامی گھریلو لمحے میں سرحد پار جمالیاتی تجربہ داخل کر دیتا ہے۔ یوں خط، نظم، موبائل اور موسیقی اظہار و ترسیل کی مختلف صورتیں بن جاتے ہیں، مگر ذرائع بدلنے کے باوجود قربت کا بنیادی سوال قائم رہتا ہے۔

اسی سوال کا سب سے تخلیقی جواب نظم کے اختتام میں ملتا ہے، جہاں شاعر محبوب کو کمرے سے برآمدے میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ دعوت ایک نسبتاً بند، اسکرین کے ذریعے دکھائی دینے والے منظر سے ہوا، پانی اور کاغذ کے براہِ راست تجربے میں داخل ہونے کی دعوت ہے۔ آغاز میں وہ خط تھے جو بھیجے نہیں گئے اور وہ نظمیں تھیں جو لکھی نہیں جائیں گی؛ اختتام میں بھیگے ہوئے خالی کاغذ کے پرزے "تمھاری نظم بننے کے لیے تیار" ہیں۔ پوری نظم میں پھیلی ہوئی عدم تکمیل یہاں ایک نئے معنی میں سامنے آتی ہے: خالی پن محرومی کا نشان ہونے کے ساتھ تخلیق کی گنجائش بھی بن جاتا ہے۔ محبوب تک اپنی نظم پہنچانے والا شاعر اب محبوب کی اپنی نظم کے امکان کی طرف اشارہ کرتا ہے، اور اظہار کا رشتہ یک طرفہ نہیں رہتا۔ معاصر عالمی ادب کے تناظر میں اس نظم کی قابلِ اعتنا خصوصیت یہی ہے کہ یہ شکستہ وقت، غیر یقینی قربت، فن کی نمائشی کھپت اور ٹیکنالوجی سے واسطہ رکھنے والی زندگی کو یک جا کرتے ہوئے آخر میں حسی بیداری اور مشترک تخلیق کا امکان پیدا کرتی ہے۔ بارش کی شدت کے ساتھ اداسی برقرار رہتی ہے، لیکن اس اداسی کے اندر وہ لمحہ بھی نمودار ہو جاتا ہے جہاں دنیا دوبارہ محسوس کی جا سکتی ہے، اور کوئی ان لکھی نظم وجود میں بھی آ سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

# قمر رضا شہزاد: منفرد استعاروں کا شاعر

ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ وہی تخلیق کار وقت کی گرد سے محفوظ رہتا ہے جس کے پاس اپنا ایک منفرد اسلوب اور زندگی کو دیکھنے کا اپنا زاویہ ہو۔۔۔۔

اردو غزل کی کہکشاں میں قمر رضا شہزاد جدید غزل کے افق پر ایک مستقل ستون کی طرح ابھرے ہیں، جنھوں نے روایت کی مٹی سے جنم لیا مگر اپنی فکری پرواز سے ایک نیا آسمان تخلیق کیا۔ ان کا فن محض لفظوں کی ترتیب نہیں بل کہ ایک گہرا قلبی تجربہ ہے، جہاں قدیم تہذیبی اقدار اور جدید انسانی المیے ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ”بڑا شاعر وہ نہیں جو بنے بنائے راستوں پر چلے، بل کہ وہ ہے جو لفظوں کے جنگل سے اپنے لیے نئے استعاروں کی راہ نکالے“۔۔۔ اور قمر رضا شہزاد کا فن اسی تخلیقی جستجو کا بھرپور اظہار ہے

یہ غالباً 2006 یا 07 کی بات جب میرا رحمت نثار لائبریری سے اکثر کرائے پر کتابیں لانے کا معمول تھا۔ ایک دن میں وہاں کتابیں دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک کتاب پر نظر پڑی جس کا نام تھا ”ہارا ہوا عشق“ منفرد نام دیکھ کر میں ایک دم کتاب کی طرف لپکا، گھر لے گیا اور اُسے ایک ہی رات میں مکمل پڑھ ڈالا۔

کچھ عرصے بعد، جب میں کسی کام سے سائیکل پر لاری اڈے کی طرف جا رہا تھا تو شہر موڑ پر انتظار گاہ میں میری نظر ایک شخص پر پڑی۔ میں رک گیا اور خود کلامی کے انداز میں اُس شخص کی طرف بڑھا۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس اُس شخصیت کو سلام کرتے ہوئے میں نے پوچھا: ”کیا آپ قمر رضا شہزاد ہیں؟“ انھوں نے پر اعتماد انداز میں کہا: ”جی۔“

میں نے کہا: ”میں نے کچھ روز پہلے آپ کی کتاب ’ہارا ہوا عشق‘ پڑھی ہے۔ وہ ایک لمحے کو حیران نظروں سے مجھے دیکھنے لگے

طارق جاوید

شاید ان کی آنکھوں میں یہ خیال تھا کہ یہ 16/17 برس کا لڑکا کون ہے!

پھر جب میں نے ان کے اشعار سنانا شروع کیے تو وہ بیک وقت حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا: ''بیٹا! تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟'' جب میں نے اپنے بارے میں بتایا تو وہ بولے: ''ہم روز شام کو اکرم آسی کے ہوٹل پر بیٹھتے ہیں، آپ کے گھر کے قریب ہے جب دل چاہے آجایا کرو۔''

میں دوسرے تیسرے دن وہاں جانے لگا اور ان سے اشعار سننے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس ملاقات میں قمر رضا شہزاد صاحب نے مجھے اپنی پہلی کتاب ''پیاس بھرا مشکیزہ'' بطور تحفہ دی یہ وہ پہلی کتاب تھی جو مجھے زندگی میں پہلی بار کسی کی طرف سے تحفے میں ملی تھی۔

قمر رضا شہزاد صاحب سے اس تعلق کو بنے اتنے برس گزر گئے ہیں، مگر وہ رشتہ اور وہ کیفیت آج بھی اتنی ہی تازہ محسوس ہوتی ہے جیسے کل کی بات ہو۔ قمر رضا شہزاد صاحب سے وہ تعلق جو اس روز بندھا تھا، آج تک اسی گرمجوشی اور محبت کے ساتھ قائم و دائم ہے۔

اردو شاعری کے موجودہ دور میں جہاں روایت اور جدت کے سنگم پر کئی آوازیں سنائی دیتی ہیں، وہاں قمر رضا شہزاد کا لہجہ اپنی انفرادی کھنک اور گہرے فکری رچاؤ کی وجہ سے دور سے پہچانا جاتا ہے۔ شاعری محض قافیہ پیمائی یا لفظوں کی جادوگری نہیں، بل کہ باطنی واردات کو کائناتی سچائیوں کے ساتھ جوڑنے کا نام ہے، اور قمر رضا شہزاد شعر کی نزاکتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ انھوں نے غزل کے کینوس پر ایسے اچھوتے استعارے تراشے ہیں جو قدیم وجدان اور جدید شعور کے درمیان ایک خوب صورت سنگم کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ان کی شاعری ایک ایسی خاموش دستک ہے جو قاری کو لفظ کی سطح سے اٹھا کر معنی کے سمندر میں اتار دیتی ہے۔

قمر رضا شہزاد کی شاعری اور شخصیت میں ایک خاص کشش ہے جو عام الفاظ کو غیر معمولی معنی عطا کر دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے قاری کے دل میں پہلے سے چھپا ہوا کوئی احساس ہو جو لفظ کا روپ دھار کر باہر آرہا ہو۔ یہی منفرد طرزِ اظہار انھیں موجودہ منظرنامے میں ایک الگ شناخت دیتا ہے۔ ان کی شخصیت بھی ان کے شعری اسلوب کی عکاسی کرتی ہے؛

منتخب اشعار؛

دل کو سپردِ شہرتِ دنیا نہیں کیا
میں نے یہ آئینہ کبھی میلا نہیں کیا

یہ سانس لیتے لوگ تمھیں خود بتائیں گے
کیوں ان کو رب خیر نے زندہ نہیں کیا

..............................

کوئی کسی کا نہیں ہو گا تیر کھینچتے وقت
یہ سوچتا تھا دلوں میں لکیر کھینچتے وقت

بدلتا جاتا ہوں راستہ اور لباس شہزاد
میں اک زمانہ کئی زمانوں سے آ رہا ہوں

میں صرف اپنی حراست میں دن گزارتا ہوں
مرے سوا کوئی زندان بھی نہیں میرا

ایک معلوم علاقے کی طرف جاتا ہوں
آسمانوں سے گزرتی ہے سواری میری

میں ایک شکل کسی حافظے سے نکلی ہوئی
میں ایک ہاتھ کسی ہاتھ سے چھڑایا ہوا

مجھے خبر ہے خدا میرے انتظار میں ہے
میں آ رہا ہوں صف گمرہاں سے ہوتے ہوئے

میں گونجتا تھا دلوں کے سکوت میں شہزاد
تمام شور یہاں میری بے زبانی سے تھا

سوال تھا ہی نہیں دوسری محبت کا
ہم اپنی پہلی محبت میں کام آ چکے تھے

میں رب نور سے ہونے لگا ہوں محوِ کلام
سوائے چراغ دعا تو بھی درمیاں سے نکل

آؤ ہم رفتگاں کو لینے چلیں
کیا خبر ان کو واقعی لے آئیں

اک دوسرے سے خود ہی الگ ہو رہے ہیں لوگ
یہ راستہ کسی کو جدا کر نہیں رہا

فلک کی دوسری جانب اچھالتا ہوں اشک
میں اپنا رنج ادھر بھی روانہ کرتا ہوں

سب اپنی اپنی طرف کھینچنے میں تھے مصروف
مجھے کوئی بھی خدا کی طرف نہیں لایا

اتنی وحشت ہے رفاقت سے مجھے
اپنے ہمراہ بھی جاتا نہیں میں

مرا نشانہ تری کائنات تھی لیکن
اچانک اپنی طرف وار ہو گیا میرا

سرد مہری کے علاقے میں ہوں مصروف دعا
زندہ رہنے کے لئے آگ جلائی ہوئی ہے

سوچ لینا یہ جنگ سے پہلے
صلح کا آخری پیام ہوں میں

عدو کا خوف بھی کیا خوف ہے، کہ بعض اوقات
میں اپنی تیغ، ہوا میں چلانے لگتا ہوں

مجھے بھی آئینے جیسا کمال حاصل ہے
میں ٹوٹتا ہوں تو پھر بے شمار ہوتا ہوں

سکوت مرگ ہر آنگن پہ طاری کر رہا ہوں
میں اپنے عہد کی منظر نگاری کر رہا ہوں

قصہ گو اب تری چوپال سے میں جاتا ہوں
رات بھی بھیگ چکی نیند بھی آئی ہوئی ہے

☆☆☆☆☆

# شہزاد نیرؔ کی ''کہانی چل رہی ہے''

جناب شہزاد نیرؔ کا نام ادبی حلقوں میں اب غیر معروف نہیں رہا۔ انھوں نے نہایت ہی قلیل عرصے میں جو مقام بنایا ہے، یہ دراصل ان کی شبانہ روز محنت، مسلسل عرق ریزی، تسلسل کے ساتھ تخلیقات اور مختلف اصناف ادب خاص طور پر شاعری میں طبع آزمائی کا نتیجہ ہے۔ وہ مشاعروں کی جان بن چکے ہیں اور ادبی رسائل وجرائد میں ان کی تخلیقات جن میں تنقیدی مضامین، خاکے، مائکروف اور رپوتاژ وغیرہ شامل ہیں، کی اشاعت کو بھرپور جگہ دی جا رہی ہے۔ وہ بنیادی طور پر فوجی ہیں۔ ملازمت کے دوران بھی مصروفیات میں سے وقت نکال کر لکھنے کی طرف توجہ مبذول کیے رکھی۔ میجر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تو ان کا ارادہ تھا کہ اب خوب فراغت میسر ہوگی اور دل کھول کر قلم چلاؤں گا لیکن قلم بیچارہ یاس وحسرت کی تصویر بنا اُن کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ گھر اور گرہستی کے مشاغل میں ایسے کھوئے کہ کئی برس تک یہ بھول ہی گئے کہ وہ بھی تخلیق کار ہیں۔ اُن کے بقول:۔ ''فوج کی ملازمت سے سبک دوش ہوا تو لگتا تھا کہ اب ہر طرف فرصت ہی فرصت ہوگی۔ جلد ہی معلوم ہوگیا کہ عیال داری بھی ایک مستقل جھنجھٹ ہے جس میں چھٹی نہیں ملتی۔ ریٹائرمنٹ کے چھ سال بعد میں نے کچھ وقت چرایا اور پرانی فائلوں کی گرد جھاڑی۔ کچھ کہانیاں پڑھ کر دل میں ٹیس اٹھی، کچھ خنجر کی طرح سینے میں پیوست ہوگئیں۔ کچھ نشتر کی طرح لگیں اور پرانا مواد بہہ نکلا۔ ارادہ کیا کہ انھیں صاف کر کے لکھوں۔ کچھ جملے بدلوں، کچھ حذف کروں۔ فالتو فقروں کی تو لمبے افسانے میں گنجائش نہیں ہوتی، یہ تو پھر صفحے

**انعام الحسن کاشمیری**

ڈیڑھ صفحے کی کہانی ہے۔ نامکمل کہانیوں کو مکمل کرکے کتاب کرنے میں کئی مہینے لگ گئے۔ اینٹ اینٹ جوڑ کر ہموار دیوار کا تاثر دینا اتنا سہل نہیں ہوتا۔"

شہزاد نیّر نے یہ کہانیاں کچھ مشاہدات اور کچھ تجربات کی بنیاد پر لکھیں۔ وہ اپنی یونٹ کے ساتھ جہاں بھی گئے، جہاں بھی رہے ان کی مشاہداتی قوت نے انھیں نت نئے موضوعات سے متعارف کروایا اور کہانیاں اپنے ریشمی بال پھیلائے، اپنی شبنمی آنکھیں کھولے اور اپنے نازک اندام وجود کے سائے لہراتے ہوئے ان کے سامنے رقص کرنے لگیں۔ ملازمت کے تقاضوں اور وہ بھی فوجی آدمی کے لیے، ممکن نہیں کہ وہ طویل کہانیاں لکھے۔ خیالات کو افسانوں کا رنگ و روپ دے اور صفحے سیاہ کرتا چلا جائے۔ طویل کہانیوں یہاں تک کہ ناول نگاروں نے بھی کسی اچھوتے خیال کو فوری طور پر باندھ کر رکھنے کے لیے انھیں انتہائی مختصر کہانی کے روپ میں صفحہ قرطاس پر اتارا تاکہ بعد میں جب فرصت ملے، تو وہ اس کو اپنے زورِ تخیل کی بنیاد پر حسب ضرورت پھیلا سکیں۔ کچھ نے تو اس فوری عمل کے نتیجے میں لکھی ہوئی مختصر کہانی کو یوں ہی باقی رہنے دیا اور کسی نے اسے پھیلا کر افسانے یا ناول کا رنگ دے دیا۔ شاید یہیں سے افسانچے کی ابتدا ہوئی۔ دھیرے دھیرے مختصر کہانیاں مختلف نام اختیار کرنے لگیں جیسا کہ مائکروفکشن، فلیش فکشن، نینو فکشن، منی کہانی، پوپ کہانی وغیرہ۔ ان میں البتہ مائکروفکشن کامیابی کے ساتھ خوب لکھا جا رہا ہے۔ اس کے لکھنے کے لیے عام افسانے کی نسبت کہیں زیادہ مہارت درکار ہوتی ہے کیونکہ ایک ڈیڑھ صفحے ہی میں پوری کہانی کو بیان کرنے کے بعد ایک زبردست تاثر کے ساتھ اس کا اختتام کرنا پڑتا ہے تاکہ قاری اس حصار میں جکڑا جائے اور تاثیر اُس کے وجود کو پوری طرح نہلا دے۔ یہ قوت تاثیر یا اثر پذیری ہی ایسے فکشن کی بنیاد ہے۔ اگرچہ اب سوشل میڈیا پر قارئین کی توجہ حاصل کرنے کے لیے لکھاری حضرات اس اصطلاح کا استعمال کر رہے ہیں، لیکن بیشتر مواد جذبات سے عاری ہوتا ہے۔ تحریر میں زیادہ گہرائی نہیں ہوتی اور اختتام ایسا متاثر کن نہیں ہوتا کہ جو قاری کے جذبات و احساسات کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے سکے۔

شہزاد نیّر نے بھی جن خیالات، مشاہدات اور تجربات کو کاغذ پر اتار کر انھیں محفوظ کرلیا وہ بھی مختصر کہانیاں ہیں جو اس کتاب ''کہانی چل رہی ہے'' میں پیش کی گئی ہیں۔ پچھلے پیراگراف میں وہ اس کی بابت بتا چکے ہیں کہ مسلسل لکھتے رہنے کے باوجود وہ انھیں کہیں اشاعت کے لیے نہیں بھیج سکے، اس لیے انھیں فائل کی زینت بناتے رہے اور جب فراغت میسر آئی تو طے کیا کہ انھیں شائع کروایا جائے۔ سوشل میڈیا فریم نے تخلیق کاروں کو فوری ردعمل دیے جانے کا ایک

زبردست پلیٹ فارم مہیا کر دیا ہے۔ یہاں پیش کردہ تخلیقات کے رد کیے جانے یا سراہے جانے کا فیصلہ قارئین کی جانب سے چند ہی گھنٹوں میں سامنے آجاتا ہے اور جس سے لکھاری کو اپنی تحریر کی اہمیت اور حیثیت کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شہزاد نیّر نے اپنی تخلیقات ''انہماک انٹرنیشنل فورم'' پر پیش کرنا شروع کر دیں۔ اس تجربے نے اُن کی خوابیدہ صلاحیتوں کو خوب اجاگر کیا اور اس میدان میں اُن کا قلم جولانیاں دکھانے لگا۔ اس سے جنم لینے والے جوش، حرکت، توانائی اور اثرات نے قاری کو بری طرح متاثر کیا۔ یہ دراصل ایک چنگاری کے موافق ہے جو دیکھنے میں تو انتہائی چھوٹی اور معمولی سی دکھائی دیتی ہے لیکن جوں جوں اس پر اپنی سانسوں کی پھوار ڈالتے جائیں وہ بڑھتے بڑھتے عظیم الاؤ کا روپ دھار لیتی ہے۔

''کہانی چل رہی ہے'' کو 2024 میں نگارشات نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شائع کیا۔ اس کی تقریب رونمائی بھی شاندار رہی۔ مجھے یہ کتاب چند ماہ پیشتر ماہنامہ تخلیق کے دفتر میں جناب شہزاد نیّر کے ہاتھوں وصول پانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ تخلیق کے دفتر میں محترمہ سلمیٰ اعوان کے اعزاز میں ایک تقریب رکھی گئی تھی جس میں شمولیت کے لیے چند گنے چنے احباب کو دعوت دی گئی۔ جناب سونان اظہر نے اس خاکسار کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ محترم غلام حسین ساجد، محترمہ مسرت کلانچوی اور دیگر چند لوگ اس تقریب کی رونق تھے۔ شہزاد نیّر سے میں اس سے قبل سوشل میڈیا اور ماہنامہ تخلیق اور ماہنامہ ادب لطیف کی وساطت سے متعارف ہو چکا تھا۔ وہ ادب لطیف کے نائب مدیر ہیں۔ اُن کی مسکراہٹ سے لبریز گفتگو ایک طرح دل موہ لیتی ہے۔ پھر اشعار اور واقعات کا ایک چشمہ ہے، جو دوران گفتگو پھوٹتا چلا جاتا ہے۔ فوجی افسران والی خشک طبیعت کے برعکس وہ بڑے ظریفانہ انداز و اطوار کے مالک ہیں جو پہلی ہی ملاقات میں اپنا اسیر بنا ڈالتے ہیں۔ ادبی ماحول نے اُن کی صلاحیت ولیاقت کو جو جلا بخشی ہے، اس نے انھیں نکھارنے، بنانے اور اپنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

''کہانی چل رہی ہے'' شہزاد نیّر کی نثر کی پہلی شاندار تخلیق ہے جس میں کوئی افسانچہ دو صفحات سے زائد پر مشتمل نہیں۔ چنانچہ ابتدائی 235 صفحات میں پیش لفظ سمیت 144 افسانچے شامل ہیں۔ جبکہ آخری حصے کے 25 صفحات میں 5 افسانے بھی شامل ہیں۔ افسانچوں میں جس درد، کسک اور حساسیت کا اظہار کیا گیا ہے، وہ تادیر قاری کو اپنے حصار میں جکڑے رکھتے ہیں۔ سادہ، مختصر لیکن پُر اثر جملوں کے ذریعے شہزاد نیّر نے کہانی کی بُنت اس انداز میں کی ہے، کہ پڑھتے ہوئے پہلے احساس ہوتا ہے کہ عام سی تحریر ہے، پھر خیال آتا ہے کہ نہیں! اچھی تحریر ہے۔ پھر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی زبردست

تحریر پڑھی جا رہی ہے اور ابھی یہ اندازہ پورا بھی نہیں ہوتا کہ یک دم ایک خنجر سا جگر میں پیوست ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی کہانی بھی ختم! درد کی ایک شدید لہر پورے وجود میں لہراتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے اس کی کسک قاری کو اپنی بانہوں میں لیے لوریاں دیتی رہتی ہے۔

''چارج'' پہلا افسانچہ ہے - یہ کہانی ایک غریب، بے کس اور لاچار شخص کی ہے جس کے بے گناہ بیٹے کو قتل کر دیا جاتا ہے اور مخالفین پولیس سے ساز باز کرتے ہوئے مظلوم شخص سے دھوکے سے صلح نامے پر انگوٹھے لگوا لیتے ہیں۔ اب یہ بوڑھا شخص ہر روز صبح سے شام تک پولیس سٹیشن کے سامنے احتجاجی کیمپ لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ ذہنی حالت بے حد ناگفتہ بہ ہو چکی ہے چنانچہ ہوا میں مکے لہراتا ہوا ظالموں کو مارتا رہتا ہے۔ پولیس سٹیشن کا نیا انچارج آتا ہے، تو وہ بوڑھے کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے اس کی بابت استفسار کرتا ہے۔ جانے والا اُسے یہ کہہ کر تسلی دیتا ہے کہ بے فکر رہو۔ اِسے بھی تمھارے چارج میں دے کر جا رہا ہوں۔ یہ مختصر کہانی ظلم و جبر، انسانیت سوزی اور چالاکی اور طرازی کی جو داستان بیان کرتی ہے، یہ ہمارے معاشرے پر کلنک کا وہ داغ ہے جو ہم منصوبوں، سکیموں اور اصلاحات کے باوجود شاید صدیوں میں بھی نہیں دھو سکتے کہ جب تک ہم تہذیب و اخلاقیات کو نچلی سے اوپر سطح تک رائج نہ کریں گے تب تک نظام درست نہیں ہو سکتا۔ جب بالائی طبقات قانون کے دائرہ کار میں آئیں گے تو نظام از خود بہتری کی جانب گامزن ہو جائے گا۔

اولادِ نرینہ کا تو ہم صبح شام سنتے ہیں۔ ہر مقام پر کی جانے والی دعاؤں میں اولادِ نرینہ کا ذکر ہوتا ہے - جن کے ہاں نہیں، تو اُنھیں عطا کیے جانے کے لیے اور جن کو عطا شدہ ہے، اُس کی بہتری اور فرمانبرداری کے لیے خوب دعائیں مانگی جاتی ہیں لیکن شاید ہماری سماعتوں سے ابھی تک ''اولادِ مادینہ'' کے الفاظ نہیں ٹکرائے - شہزاد نیّر اپنے افسانچے ''اولادِ مادینہ'' کے ذریعے یہ الفاظ ہمارے کانوں میں انڈیلتے اور بتاتے ہیں کہ بیٹوں کے لیے تو خوب وظائف ہیں لیکن بیٹیوں کی خواہش کی باریابی کس طرح ممکن ہو؟ اس کی کوئی دعا اور دوا شاید موجود نہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میاں بیوی کے والدین بننے کی تکمیل ہی بیٹی کی پیدائش کے بعد ہوتی ہے۔ کیونکہ تب اصل ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے۔

عورت جب محبت کرتی ہے، تو دل و جاں سے کرتی ہے۔ اس میں عورت کی ذات پات، قبیل اور پیشے میں کوئی امتیاز نہیں حتیٰ کہ اگر وہ طوائف ہو، تب بھی اس کی محبت ہر قسم کی لالچ، منفعت، فائدے سے ماورا ہوتی ہے۔ ''شریف زادی'' ایسی ہی ایک طوائف کی محبت کا قصہ ہے کہ جو ہزاروں روپے ایک رات کے ملنے کے باوجود اپنے محبوب کے

بستر پر کسی اور کے ساتھ سونا گوارا نہیں کرتی۔

شہزاد نیئر کا ایک افسانچہ ''حرام موت'' کے عنوان سے ہے۔ اگرچہ تمام ہی مختصر کہانیاں بڑی پُر اثر ہیں لیکن اگر حرام موت کو پڑھیں تو ایک نئی فطرت، جذبے اور احساس کا اظہار ہوتا ہے۔ بچوں کی طرح مائیں بھی سانجھی ہوتی ہیں۔ دشمن کی ماں کا بھی وہی دکھ ہوتا ہے، جو دشمن دار کا۔ اس افسانچے میں شہزاد نے فوجی ہونے کے باوجود جس حساسیت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ پڑھنے سے زیادہ سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

''ریڈیو کشمیر کارگل'' ایک دل گداز افسانچہ ہے۔ یہ افسانچہ سپاہیوں کے بیچ ابھرنے والے ایک بحث کے متعلق ہے جو شہید کے حوالے سے ہے۔ بحث طول پکڑتی ہے، تو ایک سپاہی مشورہ دیتا ہے کہ کیوں نہ ریڈیو کی عمارت ہی کو بم مار کر اڑا دیا جائے، جو اس بحث کا سبب ہے۔

مختصراً شہزاد نیئر نے زورِ قلم کا سہارا لے کر زندگی کی راہوں میں پھیلے چھوٹے چھوٹے موضوعات کے سنگ ریزوں کو جمع کر کے خوب صورت کتاب کی شاندار عمارت تعمیر کی ہے۔ جس طرح وہ خود کہتے ہیں کہ اینٹ اینٹ جوڑ کر دیوار بنانا آسان نہیں، اسی طرح سنگ ریزوں کو جمع کرنا بھی سہل نہیں۔ موضوع کا چناؤ، ابتدائیہ، کلائمکس، اختتام، الفاظ کا انتخاب، جملوں کی طوالت، غیر ضروری امور سے روگردانی اور دلچسپی کو آخر تک برقرار رکھنے کے لیے ایک طرح سے جگر کو خون کرنا پڑتا ہے۔ عام سی کہانی کو بیان کرنے کے لیے بس قلم کی روانی اور جولانی چاہیے لیکن افسانچے کے بیان کے لیے ہمیں اپنے قلم کو بھٹی میں جلا کر اور زیادہ کندن بنانا پڑتا ہے۔ شہزاد نیئر کا قلم کندن بنا، تو انھوں نے ''کہانی چل رہی ہے'' کو تخلیق کرنے کا اعزاز پالیا۔ اگرچہ وہ برفاب (نظمیں)، گرہ کھلنے تک (نظمیں)، خوابشار (غزلیں)، سوچ کے نرالے ڈھنگ (ترجمہ، ایڈورڈ ڈی بونو) اور نمبر نہیں کافی (ترجمہ رابرٹ ٹی کیوساکی) کے ذریعے اپنی تخلیقی قوت کا بھرپور اظہار کر چکے ہیں لیکن ''کہانی چل رہی ہے'' دراصل تلوار کی ایسی دو آتشہ دھار ہے، جس پر قدم رکھتے ہی تکلیف کی کسک وجود کو شکنجے میں جکڑ لیتی ہے۔ یہ کسک الگ سے ایک طرح کا لطف بھی دیتی ہے۔ ہم درد اور لطف کو ایک ساتھ محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ کہانی چلتے چلتے اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ شہزاد نیئر نے جس عنوان کا انتخاب کتاب کے لیے کیا، اس سے بخوبی مترشح ہوتا ہے، کہ وہ رنگِ تغزل سے میدانِ افسانہ نگاری میں بھی اپنے اظہار کو جاری رکھیں گے۔ شاعری اگرچہ فوری قوتِ اظہار کی بدولت جلدی متعارف ہونے کا ذریعہ ہے اور نثر نگاری بہت دیر کے بعد کہیں جا کر جان پہچان کا سبب بنتی ہے لیکن دوسری طرف ایسا بھی ہے، کہ نثر نگاری بہت دیر تک اس تعارف کو قائم و دائم بھی رکھتی ہے۔

☆☆☆☆☆

# محترمہ پروین سجل کی شاعری کا اِلہام و اِلقا

ہر شاعرہ اپنی شعری تخلیقات میں غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی شاعر کے کلام و انداز میں فیض اُٹھاتی ہے۔ اُس کا مطالعہ و مشاہدہ اُس کی تخلیقات کی روح میں اس طرح حل ہوجاتا ہے کہ وہ محسوس نہیں ہوتا۔ شاعر کا ذوقِ شعرگوئی جب تخلیق کی طرف رجوع کرتا ہے اور نمو کی خواہش اُسے شعر کہنے پر اُکساتی ہے تو اُس کا مطالعہ جو لاشعور میں ہوتا ہے، وہ اُس کی فکر و خیال کی روح میں خود بہ خود در آتا ہے۔ پھر احساسِ جمال اور اُسی کے متعلقات، عقل اور تخیل کی مدد سے نئی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اگر شاعرہ میں طباعی کا جوہر ہے، اُسلوب بیان میں مہارت ہے تو سونے پہ سہاگا ہے۔ ہر شاعرہ جو خیال متشکل کرتی ہے، اُس کا اسّی فی صد مواد مشاہدے اور مطالعے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ دونوں مختلف صورتوں میں شعری اشکال اختیار کرتے ہیں۔ ہاں بیس فی صد مواد صرف فکر و خیال سے ملتا ہے۔

محترمہ پروین سجل دوسری تمام شاعرات کی طرح نہیں ہیں۔ اُن کی شاعری پر خوابوں کا اثر ہے، وہ مکاشفات سے راہ نمائی حاصل کرتی ہیں۔ وہ الہام کی اُن راہوں پر چلتی ہیں جو اُنھیں سُجھائی گئی ہیں۔ وہ اِلقا کے اُن راستوں کی مسافر بنتی ہیں جن راستے کی نشان دہی اُنھیں خوابوں میں کی گئی ہے۔ وہ تعبیر کی پروا بھی نہیں کرتی کیوں کہ اُنھیں معلوم ہے کہ جب آغاز اتنا اچھا ہے تو انجام بھی بہ خیر ہوگا۔ وہ آمد

**شاعر علی شاعر**

کے گلشن سے اپنے تخیلات کے پھول چنتی ہیں اور اُنھیں تراش خراش کر رکھتی رہتی ہیں، جب اُن پھولوں کو اکٹھا کرتی ہیں تو ایک گل دستہ تیار ہو جاتا ہے جس کو عنوان دے کر وہ اپنی اُس شاعری کا مجموعہ ترتیب دے لیتی ہیں جو اُن کو الہام والقا اور آمد سے عطا ہوئی ہوتی ہے۔ اِسی لیے اُن کی شاعری عام شاعرات جیسی نہیں ہے، نہ اُن کی شاعری میں عام شاعرات جیسے عشقیہ مضامین ہیں اور نہ سفلی جذبات اور نہ بازاری باتیں اور نہ سوقیانہ پن۔ اُن کی شاعری تو پاکیزہ سخن کی مثال ہے۔ تقدیسی ادب کا عمدہ نمونہ۔ اللہ رب العزت کی تعریف، حمد وثنا اور اُس کی پیارے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی مدحت ونعت۔

بات دراصل یہ ہے کہ احساسِ جمال تو ساری دنیا کے انسانوں کا ایک ہی طرح کا ہوتا ہے، صرف تہذیب وتمدن کا اثر اُس کے اظہار میں کچھ فرق پیدا کر دیتا ہے۔ سماجی رویے بھی یہی صورت اختیار کرتے ہیں۔ خوشی وغمی مختلف الجہات اور انداز میں سامنے آتی ہیں اور شاعرہ کی شاعرانہ کاری گری اُنھیں موثر بنا دیتی ہے:

افلاطون کے مطابق ”شاعر انسانی زندگی کے اعمال وافعال، احساسات وجذبات، مدرکات وموثرات اور نفسیات نہایت موثر انداز میں شاعری کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ شاعر حسن وخیر، زشت وقبح، تیرگی و روشنی کا بہترین صورت گر ہوتا ہے۔ وہ اپنے مذہبی معتقدات بھی پیشِ نظر رکھتا ہے۔ شاعر میں شاعری کی دیوی، اِلہام والقا کی توانائی بھر دیتی ہے۔“

بہ الفاظِ دیگر افلاطون شاعری کو الہام ربانی سے تعبیر کرتا ہے۔ افلاطون خود بھی ذوق شاعری رکھتا تھا اور شاعر پر جو شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اُسے عطائے الٰہی کہتا ہے۔ افلاطون نے زندگی اور کائنات کی تشریح جس طرح کی ہے اُسے عقل تسلیم کرتی ہے۔ وہ فطرت انسانی کا بہت بڑا عکاس تھا۔ انسانی صلاحیتوں کو اُس نے بڑے موثر دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُس نے احساسِ جمال کو بھی منطقی صورت میں پیش کیا ہے۔ شاعری کو بھی معرضِ بحث میں لایا ہے۔ اُس کے استحسان اور مضمرات پر بھی اپنی رائے دی ہے۔ شاعر کی بڑی موثر تعریف کی ہے۔ شاعروں کے متعلق اُس نے جو اظہار کیا ہے وہ نہایت واضح

انداز میں ہے۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ وجدان سے جو بھی خیالات شاعر پر اُترتے ہیں وہ اُن کو الفاظ میں مجسم کر دیتا ہے۔

افلاطون نے اپنی فلسفیانہ سوچ میں اُسے اِلہام و اِلقا سے تعبیر کیا ہے۔ وہ انسان کا وجدانِ سلیم ہے جو شاعر کی فکر اور تخیل کی نشوونما کرتا ہے۔

افلاطون نے شاعر اور شاعری کے لیے جو باتیں کہی ہیں محترمہ پروین تجل کی شاعری اُن معیارات پر پوری اُترتی ہے ،انہیں باتوں کو میں نے مذکورہ بالا پیرائے میں پیش کیا ہے کہ محترمہ پروین تجل کی شاعری عام شاعرات جیسی نہیں ہے، وہ تو اپنے خوابوں کو شعری پیراہن عطا کرتی ہیں،اپنے خوابوں کی تعبیروں کو صفحۂ قرطاس پر سجا کر امر کر دیتی ہیں۔

محترمہ پروین تجل کو بہت سی دیدہ ور شاعرات کی طرح یہ ہنر آتا ہے کہ وہ فلسفہ وحکمت کو شعریت میں ڈھال دیتی ہیں۔ وہ سریع الحس شعرا کے قبیل میں سے ہیں جن کی قوتِ آخذہ اور حاصل کرنے کی صفت خاصی توانا ہوتی ہے جس کا اظہار اُن کے بہت سے اشعار پر غور و تامل سے ہو جاتا ہے۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

کیا عجب اسراریت ہے، اے خدائے ذوالجلال
کیا مقامِ وحدیت ہے، اے خدائے ذوالجلال

..............................

کیا سماں تھا زمزمہ اِک لَے میں تھا ڈھلتا ہُوا سا
خامشی بھی بولتی تھی، صورتِ کُن ،صورتِ کُن

..............................

بے مثال اے مالکِ فیضِ نبوت ،نورِ حکمت
کیا ولایت کے منارے ،لم یزل اے ذاتِ عالم

..............................

محترمہ پروین تجل کا تازہ حمدیہ شعری مجموعہ ''کُن سیّن دال'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے، اِس مجموعے میں بھی وہ تمام اوصاف اور خوبیاں ہیں جو میں نے اِلہام واِلقا اور آمد کی شاعری کے بارے میں کہی ہیں۔ اِس مجموعے میں بھی اُن کے خواب ہیں، مکاشفات ہیں، خوابوں کی تعبیریں ہیں، تخیلات ہیں، الہام ہے، اِلقا ہے اور آمد ہے۔ ایک شاعرہ اِس قدر اہم، دقیق، نرالی، جدید اور اثر انگیز حمدیہ اور نعتیہ شاعری کر رہی ہے یہ خوش آئند بھی ہے ،خوش گوار حیرت میں مبتلا کرنے والی بھی اور چونکا دینے والی بھی۔ میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

# ''دورانیہ کا بیانیہ''

آزاد نظم کا ہر شاعر کوئی نہ کوئی الگ دنیا تخلیق کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ موضوعاتی دائرہ اور اسلوب قرار دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ غزل کے بارے میں واضح موقف موجود ہے کہ سیکڑوں آوازوں میں الگ آواز کم سنائی دیتی ہے لیکن آزاد نظم کے بڑے کینوس پر رنگ بھرنے کا عمل نظم کو شاعر کو غزل گو سے جدا کر دیتا ہے۔ غزل کی یکسانیت سے گھبرانے والوں کو نوید ہو کہ جناب نوید صادق کی آزاد نظموں پر مشتمل مجموعہ ''دورانیہ'' متنوع خصوصیات کا حامل ہے۔ مجموعی طور پر یہ نظمیں نارسائی، رائیگانی اور ناآسودگی سے عبارت ہیں۔ اس باب میں انھوں نے زندگی کی تلخیوں کو جس شدت احساس سے رقم کیا ہے۔ ایسی شدت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ نظمیں فنی صلاحیتوں سے مزین اور فکری توانائی سے بھرپور ہیں۔ وہ ناسٹلجیا کے آئینے میں زندگی کو دیکھتے ہیں اور معمولات کو آسانی سے نظم کی صورت میں ڈھالنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ عام شاعر معمولات کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن نوید صادق انھیں تخلیقی سطح پر بیان کر کے حیران کر دیتے ہیں۔

زندگی کی پیچیدگی سے حساس دل سخت خائف ہیں اور اس کے اردگرد ناآسودگی کا پھیلاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ تیز رفتار زندگی مڑ

شاہد اشرف

کر کسی کو دوسروں کے طرف دیکھنے کا موقع نہیں دیتی ہے۔ ہم سب اپنی ہی دھن میں بھاگے جا رہے ہیں۔ یہ نظمیں ہمیں کچھ دیر رک کر اپنے اردگرد بسنے والے انسانوں کو دیکھنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ انھوں نے بجا طور پر قاری کو واقعاتی اور کرداری سطح پر دیدہ زیب اسلوب سے متوجہ کیا ہے۔

پہلی نظم ''میں داستانوں کا آدمی ہوں'' ان کی فکری جہت کے تعین میں مدد دیتی ہے۔ آنگن میں لگائے درخت کے کٹنے سے ماضی کے تمام واقعات محو ہو گئے ہیں۔ درخت جانتا تھا کہ اس کے سائے میں کون کون بیٹھا تھا اور شاخوں پر کن پرندوں نے گھونسلے بنائے تھے۔ اب لوگ خوشی اور غم میں شریک نہیں ہوتے ہیں۔ کسی کو اپنے ہمسائے کی خبر نہیں ہے۔ اچھی روایات پرکھوں کی کہانیوں میں زندہ ہیں۔ جدید زندگی کا المیہ ظاہر کرتا ہے کہ لاتعلقی، بے پروائی اور عدم توجہی کے نتیجے میں انسان مغائرت کا شکار ہو گیا ہے۔

میں داستانوں میں جی رہا ہوں\
میں کیسے کہہ دوں\
کہ کوئی نغمہ بہار آور تھا ان دنوں جب\
کسی کی آنکھوں میں آنسو آتا تو ایسے لگتا کہ\
سارے گاؤں میں جیسے ماتم بپا ہے کوئی\
کہیں خوشی کی نوید ہوتی تو سات گاؤں تلک\
ہواؤں میں رنگ اڑتے تھے، دودھ بٹتا تھا

---

ایک اور نظم ''میرا کیا ہے'' یکسانیت اور جمود کے درمیان رائیگانی کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ نظم ہر ادیب کا المیہ بھی ہے۔ ہم لفظوں میں زندہ رہنے کی خواہش میں کتابوں میں دفن ہو جاتے ہیں۔ اپنے کمرے میں کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور پڑھنے کو فرصت نہیں ملتی ہے۔ خالی گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے جہاں بیٹھ کر کسی کی یاد میں کچھ وقت گزارا جائے۔ ہم اپنے ہی گھر میں کسی کی عدم موجودگی میں اجنبی ہو جاتے ہیں۔ کتابوں سے کب تلک جی بہلایا جا سکتا ہے۔ ایک انسان کی ضرورت ہے جو اب صرف دل میں بستا ہے۔

میرا بھی اک گھر ہے جس میں\
اک کمرے میں میرا سب کچھ رکھا ہے\
چند کتابیں، اک کرسی، اک میز\
رات گئے تک کرسی چیختی رہتی ہے\
میز کی بک بک سن کر لفظوں کے مجموعے\
کرلاتے ہیں\
میری جانب دیکھتے ہیں

میرا کیا ہے؟

ان کی نظموں میں بے ثباتی اور نارسائی ہے۔ زندگی کی بے معنویت کا احساس بھی جا بجا ملتا ہے۔ انھوں نے صیغہ واحد متکلم کے ذریعے اپنے عہد کی تصویر کشی کی ہے۔ ہم سب اس زندگی کے مسائل سے مسلسل نبردآزما ہیں اور اس کے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔

ایک مختصر نظم ملاحظہ کیجیے۔

### شکستگی

ہار گیا ہوں
ہار کا مطلب جانتے ہو نا!

چلتے چلتے ایکا ایکی رستے بجھنے لگتے ہیں
منظر اور پس منظر سارے رنگ بدلنے لگتے ہیں
کوئی آگے دھول میں گم ہو جاتا ہے
کوئی پیچھے خاک میں گھل مل جاتا ہے
سائے تمہارہ جاتے ہیں
چلتے چلتے تھک جاتے ہیں
میرے اور تمہارے جیسے
کس گنتی میں آتے ہیں!

.........

وہ ڈرامائی انداز میں منظر در منظر قاری کو ساتھ لے کر چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ بالکل جیسے خواب میں منظر بدلتا ہے اور ہم اگلے منظر میں از خود منتقل ہو جاتے ہیں۔ پچھلا منظر محو جاتا ہے اور ہم آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ نوید صادق کی نظمیں پڑھتے ہوئے میں اس خواب ناک صورت حال سے دوچار رہا ہوں۔ نظم کا پچھلا حصہ ذہن سے محو ہو جاتا ہے اور نظم خواب کے مانند اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے۔ یہ اسلوب میرا جی کے ہاں بھی ملتا ہے اس اعتبار سے میرا جی کے بعد نوید صادق کے ہاں یہ اسلوب حیران کن طور پر غیر معمولی انداز میں ظاہر ہوا ہے۔ غلام حسین ساجد دیباچے میں لکھتے ہیں:

”میرا جی کا ابہام وجودی ہے جب کہ نوید صادق کا ابہام مجلسی، اس لیے کہ میرا جی کی تفہیم کے لیے اس کے باطن کی سریت سے معاملہ کرنا پڑتا ہے اور نوید صادق کے ابہام کو افشا کرنے کے لیے اس کے مخاطب سے، خواہ وہ موجود ہے یا غائب۔“

اُردو نظم کے باب میں یہ طرزِ اظہار خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں میری آواز سن، پانچواں دکھ، بلا عنوان، المیہ، میرا ذمہ نہیں قابلِ ذکر ہیں۔

☆☆☆☆☆

# پیر طریقہ پیر راجا نیئرؔ پاک پتن والے

میں راجا نیئرؔ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ کھلی شلوار قمیض پہنتا تھا اور نان چنے کھاتا تھا، اور راجا نیئرؔ لطیف کھلاتا تھا ہوا کے زور سے اُڑتے ہوئے بالوں کی لٹ کو روکتا دوسرے ہاتھ میں کیمرہ پکڑے اور ایک شاپر میں دوستوں کی تصویریں لیے کبھی ریڈیو کبھی ٹی ہاؤس، کبھی مجلس ترقی ادب کبھی "فنون" کبھی ٹی وی اور کبھی کبھی بیوی کے پاس نظر آتا تھا۔

اس کو دیکھ کر لگتا تھا یہ لاہور شہر کی پیمائش کر رہا ہے۔ اس کا قد اتنا ہے کہ بونوں کے شہر عالم چنا لگتا ہے۔ چیک دار شرٹ اور نئے ڈائزین کی پینٹ پہنے کاندھے پر بیگ لٹکائے ایک پاؤں پر روز دے کر تیز تیز چلتا ہوا راجا جب کسی بس یا ویگن میں سوار ہوتا تو سارے بچے پکار اُٹھتے کہ اماں اماں گولی ٹافی والا آ گیا۔

یوں بچوں کی اماں اسکو ایک نظر دیکھتی ہے اور کہتی ہے یہ یہ گولی ٹافی والا نہیں، اے تے ترے ابے دی دوائی ویچ والے۔

راجا نیئرؔ پنجابی کے اُستاد شاعر ظہور حسین ظہور کا شاگرد ہے، مگر حرکتیں ایسی کرتا ہے کہ لوگ اس کو تنویر ظہور کا شاگرد سمجھتے ہیں۔

یہ پنجابی شعر و ادب سے اس قدر متاثر ہے

**اعجاز رضوی**

کہ شیکسپیئر کو بھی کچھ نہیں سمجھتا اور صاف کہہ دیتا ہے کہ جناب جی جے شیکسپیئر پنجابی وچ کجھ لکھ لیا اے تے سامنے لے آؤ، میں من لاں گا۔

نالے بابا فرید ایوارڈ بھی دے دیاں گا پر دسو تے سہی کے ماں بولی وچ اس دا کم کی اے۔

آپ اس سے پوچھیں آج کل پنجابی زبان کا بڑا شاعر کون سا ہے تو یہ فوراً فیتا لے کر شاعروں کے قد ماپنے لگتا ہے پھر فہرست بنا کر مدثر اقبال بٹ سے پوچھا ہے سر جی دسو کیہڑا شاعر وڈا اے، تو مدثر اقبال بٹ صاحب اُسے ڈانٹتے ہوئے کہتے ہیں، راجا اے فہرست لکھن وچ ٹائم ضائع نہ کریا کر، سیدھی طرح میرا نام لے راجا نیر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی تنقیدی بصیرت کو بہت مانتا ہے اور کہتا ہے جناب عالی غور کیتا کرو، خواجہ صاحب نے جو نظماں لکھیاں نیں انہاں دا جواب نہیں، کبھی کبھی تو یہ عقیدت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ یہ خواجہ فرید کی شاعری بھی خواجہ ذکریا کے نام سنا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ چھڈ جی، اے وی خواجہ اوہ وی خواجہ، کیسے نوں کی پتہ لگنا اے، راجا نیرؔ ایف ایم بجا توے پر خوب بولتا ہے، مگر جب وہاں سے پیسے نہیں ملتے تو اور زیادہ بولتا ہے اس کا یوں بے وقت کا بولنا ہی اس کی ترقی میں رکاوٹ ہے، اور یہ آج سے نہیں بہت پہلے سے ہے۔

جب اس کا پہلا شعری مجموعہ محبت زندگی ہے شائع ہونے کے قریب تھا تو انھیں دنوں اس نے احمد ندیم قاسمی صاحب کی بہت سی فوٹو بنائی فوٹو بہت شاندار اور جاندار تھیں، سو قاسمی صاحب نے محبت میں اسکی کتاب کا فلیپ لکھنے کا وعدہ کیا پھر لکھ بھی دیا۔

کتاب شائع ہونے کے بعد جب لوگوں نے فلیپ کی تعریف کی تو راجا کو بہت بُرا لگا۔ اس نے برسرعام اعلان کر دیا کہ اگلے ایڈیشن میں وہ قاسمی صاحب کا فلیپ نکال دے گا کیونکہ لوگ شاعری سے زیادہ فلیپ پر بات کر رہے ہیں جبکہ اس وقت میرا مشورہ تھا کے فلیپ رہنے دے ”شاعری نکال دے“ اس وقت یہ اس پر بھی راضی ہو گیا تھا، کسی بھی معاملے کو سوچے سمجھے بغیر فوری رضامندی اس کی فطرت ہے، بس فوٹو سیشن کے معاملے میں یہ کس طرح بھی

دوسرے کی نہیں مانتا، بس اپنی کرتا ہے، مگر فوٹو ایسی کھینچتا ہے کہ سب کچھ بدل کر رکھ دیتا ہے مثال کے طور پر اگر یہ زاہد ہما کی فوٹو کھینچے تو لگتا ہے، کسی دانشور کی تصویر ہے ایک بار یہ مجھے اور اختر شمار کو جناح باغ لے گیا اور مختلف پوز اور مختلف جگہ پر بہت سے فوٹو بنائے۔ میری ڈاڑھی اور اختر شمار کی مونچھوں کو دیکھ کر وہاں موجود لوگ اس کے بارے میں فکرمند ہو رہے تھے، کسی ایک نے تو اس سے پوچھا بھی، اے گورے چٹا صاف شفاف چہرے والے گول مٹول منّے یہ ڈاڑھی مونچھ والے آپ کو کچھ کہہ تو نہیں رہے، اگر کچھ نہیں کہہ رہے تو بیٹا ہمارے ساتھ آجاؤ ہم پیسے بھی دیں گے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہر انسان کی زندگی کے مختلف ادوار ہوتے ہیں اُن میں بچپن، جوانی اور بڑھاپے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، مگر ہمارے یار دلدار راجہ نیر کی زندگی کے اتنے ہی دور ہیں جتنی اس کی عمر اس کی عمر کتنی ہے، یہ بات بابا فرید گنج شکر ہی بتا سکتے ہیں، ویسے حالات کی گواہی بھی بتا رہی ہے کہ یہ خاصا پرانا بندہ ہے یوں سمجھ لیں، کہ اس کے بیٹے کی عمر اس کے پوتے سے کم ہے، اس کی کتابوں کی تعداد اس کی پینٹنگ سے کم ہے اس کے مضامین کی تعداد اس کی شاعری سے کم ہے گویا، کم زیادہ کے چکر میں اس نے خود کو ہی کم زیادہ کر دیا ہے۔ یہ 1982 میں لاہور آیا۔ بہت سے اور شاعر ادیب بھی 82 میں لاہور فتح کرنے آئے، پھر ہتھیار پھینک کے یہیں کے ہو رہے، مگر راجا نیّر کئی بار واپس پاک پتن گیا اور وہاں سے بہت سی شکر بھی لایا اور لاہور میں کلم کلا بیٹھا میٹھی چائے پیتا رہا۔ آخر اس کے اہل خانہ نے اس کی کینٹین بند کر دی اور اس نے دوسرا کچن بنا لیا، اس کچن کی تعمیر کے بعد، اس نے مصوری، شاعری، اینکری اور تنقیدی بصیرت والی ڈگریاں دیوار پر لگا کر برتنالوجی، صفائی کرلوجی، بچہ سنبھالوجی اور چائے بنالوجی میں ایم اے کیا اور آجکل بہت خاموشی سے پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ اور اس کی ممتحن صاحبہ بھی بہت خوش ہیں کہ پڑھا پڑھایا شاگرد کم ہی ملتا ہے۔

لکھنے پڑھنے کے معاملے میں یہ بہت تیز طرار ہے اور اس کی تیزی طراری کی وجہ سے یہ ایک دن ایک تقریب میں ایک خاکہ پڑھتے ہوئے، اس کو آواز آئی، بے جا بے جا، اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر خاکہ پڑھنے لگا اتنی دیر میں نجیب احمد صاحب سٹیج پر آئے اور اس کو سٹیج سے نیچے لے آئے - وہاں بیٹھے ہر شخص کا خیال تھا کہ آج ادبی خاکہ نگار راجا نیئر کے ساتھ زیادتی نہیں اجتماعی زیادہ ہوئی ہے مگر کون سی زیادتی، راجا نیئر تو اپنے مزاج کا بندہ ہے یہ مسلسل __ ہنستا رہا اور کہتا رہا کوئی گل نہیں کوئی گل نہیں یارا یہ کوئی معمولی گل نہیں نجیب احمد نے مینوں لایا اے، کوئی جونیئر لا دا تے مسئلہ بن جاناں سی۔

راجا نیئر شروع سے ہی بہت سے کام کر رہا ہے۔ مگر ٹائٹل کے حوالے سے یہ بہت سنجیدہ ہے کیونکہ اس کام کے پیسے فوراً مل جاتے ہیں یہ اُستاد اللہ بخش کی پینٹنگ سے بہت متاثر ہے، اور اسی طرز پر پنجاب کے دیہات کو پینٹ کر رہا ہے۔ اُن پینٹنگز کو دیکھ کر خود استاد اللہ بخش کئی بار کہہ چکے ہیں کہ اُستاد نیئر اب تو مجھے بخش۔

راجا نیئر بہت زیادہ احتیاط پسند شخص ہے اسی لیے جب یہ موٹر سائیکل پر سوار کسی انڈر پاس سے گزر رہا ہو تو اپنا سر جھکا لیتا ہے پھر پوچھتا ہے، پا جی، انڈر پاس لنگھ گیا، پھر اطمینان ہونے پر سر اوپر اُٹھاتا ہے، اور کہتا ہے، یار چار وال نے، ایہہ وی رگڑے گئے تو لوکی سمجھن گے، پیدل بندہ ہیلمٹ پا کے جا رہیا اے راجا اپنے سر کے بارے میں بہت فکرمند رہتا ہے پہلی شادی کی مشکلات نے اس کو بالکل گنجا کر دیا تھا، اسی لیے اس نے دوسری شادی کی ساری سلامی سے سر کے بال لگوا لیے اور ٹوپی خریدنے میں لگا دی۔

راجا نیئر کو فخر ہے کہ وہ بابا فرید گنج شکر کے شہر پاک پتن میں پیدا ہوا باباجی کی طرف سے جو چیز اسے ملی وہ اس کا گنج ہے جبکہ شکر کے لیے یہ روز داتا صاحب سے درخواست کرتا ہے۔

اس کے فیکشن دیکھ کر لگتا ہے اس کو گنج شکر ملنے والی ہے اور تب ہی ہم کہیں گے کہ یہ راجا نیئر نہیں بابا نیئر ہے۔

سو بابا نیئر تری خیر ہو۔

☆☆☆☆☆

# کائنات کی بے کرانی میں اک بے راہ لاسلکی آوازہ

اے سیارو! کاہ کشانو! کہر وجودو!
اے تحلّوتو! اے ویرانو! نئے جہانو!
تم اس رنگلی ویرانی کی، دم دم متحرک
جگمگ دھند کے پیچھے
یہ پیغام اگر سنتے ہو،
سنتے اور سمجھتے ہو
تو اس جگمگ ویرانی کے پار ہماری جانب
اپنے اکتائے اکتائے لہجوں والی، رسمی رسمی
سطروں پر مبنی بے رس نظموں کا ____ کوئی
گھسا پٹا مجموعہ بھیجو!
ہم کو یہ مجموعہ کتنا نیا لگے گا
تازہ تازہ
ہاتھ نہ آسکنے والے، سربستہ رازوں کا بستہ
اک مدت میں، ہم لوگ اس کو پڑھ پائیں گے
اک مدت تک، ہم اس کو سمجھیں گے، سمجھائیں گے
اک مدت میں، ہم لوگ اس کی نقل اڑا پائیں گے
پھر، اک دن ہم یہ پیغام دوبارہ اس
ویرانی کی اس جھلمل
دھند میں پھیلا دیں گے
تاکہ ہمیں، اس جگمگ تنہائی کے
کسی بہت آباد علاقے سے
کچھ نئے خیالوں، نئے جمالوں، نئے
کھلے لہجوں کی،
نئی کمک مل جائے
سچ پوچھو تو اب یہ دنیا، سکڑ سمٹ کر
اپنی سوچوں کے پھیلاؤ میں بھی،
ہم کو اتنی یکساں لگنے لگی ہے
کہ اب ہم کو اس دھرتی پر
کوئی حرف نیا لگنے کی خصلت سے معمور نہیں لگ پاتا
ہم اک دوسرے سے بھی اکتائے
اکتائے پھرتے ہیں
کوئی نیا مجموعہ بھیجو!
ہم کو باہر سے آنے والی ہر شے اچھی لگتی ہے
خواہ وہ کوئی اندیشہ ہو
چاہے دشمن کی پھیلائی ہوئی باتیں ہوں
یا، وہ دشمن کے برسائے ہوئے گولے ہوں
تم تو بہت ہی ذہین ہو تم تو، یہ پیغام سمجھ جاؤ گے!
کب آؤ گے؟
اس ویران خلا سے گزر کر
اس بے پایاں اکتاہٹ کے پار اُتر کر
یا پھر ہم کو تم پر اور تمھارے نیلے سیارے پر
قبضہ کر کے تمھیں بتانا ہوگا
یہ سمجھانا ہوگا
اکتائے اکتائے رہنا اچھی بات نہیں ہے

**خالد احمد**

# ظرف وزنجیر

اک رخ سے مذہب کی کہانی
بس بندے اور رب کے
ربط کا کھاتہ ہے

دوسرا پہلو
انساں کا
انساں سے رشتہ بندھواتا ہے
مشترکہ منشور کا
حلف اٹھواتا ہے

اللہ سے ذاتی رشتے کی
رمزوں میں
آزاد ہے انساں
اپنے ظرف کے حسن و قبح سے
اپنا دامن
جنت کے میووں سے بھرے
یا دوزخ کا سامان کرے

دوجوں ساتھ تعلق میں
حق نہیں کسی کو
سانجھی سوچ لکیروں کا
اپمان کرے
اپنے نفسوں کی اندھی رو میں
اوروں کا نقصان کرے
اتھری من مانی کی مستی میں
سب کے ساتھ اسارے
اپنے وعدوں کا بطلان کرے
ساری مخلوقوں سے
اپنی افضل ہستی کو
جب چاہے شیطان کرے

پنچایت ہو یا کہ عدالت
مذہب ہی کے حکمِ جلی سے
اُس پر فرض ہے
اوروں کے مجرم کے لیے
بھرپور سزا اعلان کرے

جلیل عالی

# نظم

بکھیروں آنگنوں میں چاند بن کر پھول کرنوں کے
میں سورج کی ضیاء کا مرکزِ ترسیل ہو جاؤں

اک ایسی سرمدی آواز میں تحلیل ہو جاؤں
سماعت کے افق پر نغمہ خواں جبریل ہو جاؤں

غور و فکر کے دریا میں مجھ سے روانی ہو
خرد کی برف پگھلے آگہی کی جھیل ہو جاؤں

کلیم آئے میسر ساتھ دوں اس کا عصا بن کر
تعاقب میں کوئی فرعون پاؤں، نیل ہو جاؤں

پریشاں خواہشوں کو شکل دوں مضبوط لمحوں کی
شکستوں کی فضا میں جیت کی تشکیل ہو جاؤں

کسی ایوان کی جگمگ بڑھا دینے سے بہتر ہے
کہیں ظلمت گزیدوں کے لیے قندیل ہو جاؤں

بشارت قُربِ منزل کی ملے میرے حوالے سے
اگر پتھر ہی ٹھہرا ہوں تو سنگِ میل ہو جاؤں

جلاتا ہے کوئی نادان ہی اپنے ٹھکانے کو
میں کیوں اس نامناسب حکم کی تعمیل ہو جاؤں

محبت چند لمحوں میں ہی پوشیدہ نہ رہ جائے
دعا ہے یہ کہ اس اجمال کی تفصیل ہو جاؤں

مراسم کے لیے اب رہ گئی ہے ایک ہی صورت
بدل سکتا نہیں اس کو خود تبدیل ہو جاؤں

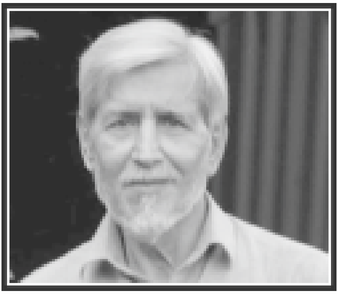

گلزار بخاری

# بالآخر

خاور اعجاز

ہوا اک نازنیں ہے
غم کے بوجھل موسموں میں
مشفق و غمخوار ہستی کی طرح
نادیدہ ہاتھوں سے
ہمیں جب تھپکیاں دیتی ہے
اور لوری سُناتی ہے
تو ہم اکثر پرندوں کی طرح
اُس کے بہاؤ پر
پرِ پرواز کھولے
اُڑنے لگتے ہیں
کسی آسودہ منزل تک لیے جانے کا وعدہ کر کے
چاروں سمت میں چلتی ہُوا
جب ریگزاروں میں پھراتی ہے
سرابوں میں گھماتی ہے
بالآخر ملبے کی گود میں لا کر بٹھاتی ہے
تو ہم کو زندگی کی فہم آتی ہے!

# خوشی، خوش رنگ تتلی ہے

"خوشی،
خُوش رنگ تتلی ہے
چمن میں جُھولتی شاخوں پہ مُنڈلاتی،
گُلوں کو چُومتی،
غُنچوں سے،
کلیوں سے،
بصد ناز و ادا اٹکھیلیاں کرتی،
شگوفوں سے گلے ملتی
مہکتے، جُھومتے سبزہ کے سنگ،
ہوا کے دوش پہ،
دیوانگی کا رقص کرتی،

تعاقب کرتے ننھے مُنّے بچّوں کو،
کئی زگ زیگ رستوں میں بھگاتی،
تھکاتی اور ستاتی
کسی اگلے ہی لمحہ،
ننھی مُنّی مُٹھیوں میں قید ہوکر،
بلند آہنگ نعروں اور شور ہاؤ ہُو میں،
ذرا سی دیر کو، بچّوں کے چہروں پر،
ہنسی اور قہقہوں کے رنگ بکھراتی
اچانک،
مُٹھیاں کُھلتے ہی،
یک دم، پُھر سے اُڑ جاتی ہے
چمن کا حصّہ بن جاتی ہے
کسی کے ہاتھ نہ آتی
خُوشی،
خُوش رنگ تتلی ہے

محمد انیس انصاری

# آشوب

ہم جو انجان راہوں پہ چلتے رہے
ہم کو تیرہ شبی کے سوا کیا ملا
ہم نے غیروں کے زخموں پہ مرہم رکھا
اور اپنے دُکھوں پر سسکتے رہے

ہم خطا وار تھے یا سزاوار تھے
جاں کے آزار میں جو گرفتار تھے
درد بڑھتا رہا جاں نکلتی رہی
کس سے شکوہ کریں کس کو الزام دیں
اپنی نظروں میں خود ہم کھٹکتے رہے

جام لبریز تھا تشنگی خوب تھی
پاس منزل کے آ کر ترستے رہے

سید افسر ساجد

---

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثنا گر وضو کریں

# نا موجود کا استقبال

علی محمد فرشی

مٹی گوندھ کے  
لوچ آنے کو رکھ دی ہے  
اور جس پیڑ کو  
کاٹ کے  
چاک بنایا تھا  
اُس کے بیٹے کو  
بانہوں میں بھر کے رویا ہوں  
دل کو دھو کر پاک کیا ہے  
اک نادید کی آس لگا کے  
'لا' کے سامنے بیٹھ گیا ہوں  
دیکھتے رہنا!  
کیسے چرخ گھماؤں گا  
اک تازہ نظم بناؤں گا

---

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

اے مرے عہد کی بے ہنر مفلسی  
دوستوں کے لیے نقدِ جاں بھی نہیں

# شاید

مری آنکھوں کا دریا تھا
جو دل کے ٹانڈ پر رکھے
کئی مکتوب گیلے کر گیا ہے
سطریں پھیکی پڑ گئی ہیں
اور سب الفاظ مدھم ہو گئے ہیں
اب انہیں پہچاننا مشکل ہوا ہے
ان کی کوئی شکل بنتی ہے
نہ ان سے خوش بو آتی ہے
یہ میری جلتی سانسوں کی تپش سے بھی
نہیں سوکھیں گے
بہتر ہے
انہیں لے جاؤں بھولی بسری گلیوں میں

یہ ممکن تو نہیں
شاید !
انہیں کچھ یاد آ جائے
تو سب سطریں چمک اٹھیں
معانی کے چراغوں کی لویں روشن ہوں
ٹوٹے خواب کی بے رنگ کڑیوں سے
کوئی زنجیر بن جائے
پرانے، خاکی کاغذ میں بسی خوش بو کے
رنگوں سے
کوئی تصویر بن جائے

طالب انصاری

## دریائے سندھ (جگلوٹ سے سکردو کے راستے میں)

فلک بوس چٹیل پہاڑوں کی
سنگین زنجیر پہنے ہوئے
خاک آلود دریا
تڑپتا، مچلتا، اُچھلتا،
چٹانوں سے لڑتا ہے جا رہا ہے
فلک سے ذرا نیچے
چٹیل پہاڑوں کی خمدار پتلی سڑک پر
مرا کارواں اپنی منزل کی جانب رواں ہے
یہاں سے جو دیکھوں،
تو دریا ہے
نقشے پہ کھینچی ہوئی اک لکیر
ذرا ڈگمگاؤں
تو دریا تلک بھی نہ شاید پہنچ پاؤں
پر اس پُرخطر راستے میں
مرے ساتھیوں کے حسیں چہچہے،
گیت اور قہقہے
پہاڑوں سے ٹکرا کے واپس چلے آ رہے ہیں
مرا کارواں اپنی منزل کی جانب رواں ہے
ادھر
خاک آلود دریا
تڑپتا، مچلتا، اُچھلتا
چٹانوں سے لڑتا ہے جا رہا ہے
نہ جانے ہمیں کیا کہے جا رہا ہے......

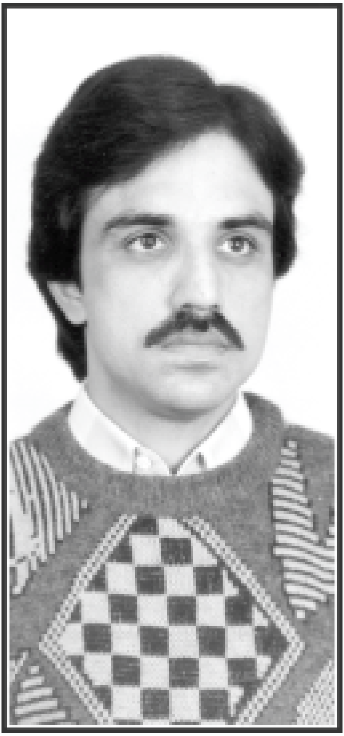

جمشید چشتی

# نو صدیوں کا کرب

کس کرب سے آنکھیں چار ہوئیں
یہ کیسا سفر آغاز ہوا
گھونگھٹ الٹا صحرا کی گرم ہواؤں نے
اندھیاروں نے لب ثبت کیے پیشانی پر
اور دشت کی دہکی مٹی نے تری مانگ کے
اجلے رستوں میں سیندور بھرا
طوفان کی دستک نے کھولے در ترے عروسی
کمرے کے
اک آگ اٹھی، اک آگ بجی
اک آگ بجھی غالیچوں کے سب غنچوں میں
گل چہرہ نوکِ خار نے آخر چوم چوم کر چاٹ لیا
ترے حجلۂ تن کی مہک چرا کر جنگل میں چھپ گئی ہوا
انگار بدن پر زیور زیور جڑے رہے

آزار نئے بستر کی شکن میں پڑے رہے
تری برف آنکھوں کے کاجل کی ان سرد سیاہ
لکیروں سے
ادھ جلی ہوئی شمعوں کا دھواں
پلکوں سے رواں
دیوار سے لے کر درزوں تک
ہر آہٹ اک پیغام ملا
کوئی پھول کھلا؟
کوئی پھول کھلا؟
اس گلشنِ بطن کی ڈالی پر
اک آتشِ گل کی آمد تک
شعلوں سے ہم آغوش رہو
خاموش رہو
لوہا کاٹو، مٹی چاٹو
ترے پلتے درد کے سائے کو صدیوں پہ محیط ٹھہرنا ہے
تخلیق کا کرب مسلسل ہے
اسے نو صدیوں تک سہنا ہے

رخشندہ نوید

# نظم

## [ شادی کی اُنتیسویں سالگرہ کے موقع پر ]

اُنتیس برس ہوتے ہیں
ایک الگ دُنیا میں بسنے والی تم
اور اپنی ہی دُنیا میں رہنے والا میں
اَنجان راستوں کے ہمسفر ہوئے
زندگی خواب تھی اور ایک حیرت کدہ
سالوں بعد معلوم ہوا کہ تمھارے خواب الگ تھے
اور میرے خوابوں کی دُنیا یکسر الگ
تمھاری دُنیا محدود (عائشہ، عمر اور میں)
مگر میری دُنیا صحراؤں کی مانند وسیع
تم شہر کی ایک سادہ لوح معصوم لڑکی
میں گاؤں کا ایک چالاک آدمی
میں خوابوں کی دُنیا کا باسی
اور تمھیں حقیقت کی دُنیا میں رہنے کی خُو
تم عام سی بہت خاص
اور میں خاص سا بہت عام

اُنتیس برس ہوتے ہیں
طویل مسافت کے اِس کٹھن سفر میں
گزرتے وقت کی ہر دھڑکن سرگوشی کرتی ہے
کہ مبہم لفظوں کی دُنیا میں
زندگی کا سب سے سچا اور بامعنی لفظ
محبت نہیں ہے......
ہم...... ہے

**طلعت شبیر**

# پہلا حرف

میرے پاس تمہارا درد مٹانے کو
کوئی محل نہیں،
نہ تمہاری انگلیوں میں سجانے کو
ہیروں کا کوئی ہار ہے،
نہ جواہرات، نہ زیور۔
میرے پاس تو بس
آرزو کی ایک آیت ہے،
امید کی ایک روشن دعا ہے،
دعاؤں کا ایک سلسلہ ہے،
اور وہ محبت ہے،
جو روح کے خاموش گوشوں میں
بے صدا، بے خبر،
ہر لمحہ بڑھتی رہتی ہے۔
ہر شب کی چاندنی،
اگر تمہیں چاندنی عطا کرتی ہے،
تو مجھے وہ روشنی بننا ہے
جو تمہارے راستوں سے اندھیرے چرا لے۔
اگر سورج
تمہاری رعنائیوں کو نکھارتا ہے،
تو مجھے وہ کرن بننا ہے
جو تمہارے چہرے پر
مزید اجالا بکھیر دے،
اور دنیا کے ہر اندھیرے سے
تمہاری حفاظت کرے۔
تم میرے لیے
صرف ایک شخص نہیں،
ایک مکمل کائنات ہو۔
اور یہ دل
مرجھایا ہوا کوئی پھول نہیں
کہ موسم بدلے
اور کسی وعدے کی طرح
خاموشی سے ٹوٹ جائے
یہ دل
وقت کے ہر امتحان کے بعد بھی
تمہیں ہی چنے گا،
آج بھی،
کل بھی،
اور اس گزرے ہوئے کل کے
اگلے کل میں بھی۔
تم ہی رہو گے
میری ہر دعا کے آخر میں،
میری ہر امید کے آغاز میں،
اور میری محبت کے
آخری لفظ تک۔۔۔

علی رضا احمد

# نہیں ممکن کہ مانجھی سے ستارہ دوستی کرلے

ہنسے اِتنا
نئی کشتی
پُرانا شوق
دل میں پال رکھا تھا

گلے مِل کر
خوشی سے
درد کرتے جسم
اک دوجے پہ گرتے تھے
پھر اس پاداش میں روتے رہے پہروں

خریدی تھی
وہ ناؤ
رہن رکھ کر خواب
پائیں باغ بیچا
خاک چھانی
اور دریوزہ گری کی

ساریاں
ساحل کی ٹھنڈی ریت پر شب کو گواہی
دے
ہمارے ہاتھ کانپے
دستخط کرتے
وہ دستاویز
اُترتا رنگ وروغن
گوشواروں کے اثاثوں کا
اِدھر چہرے اُترتے تھے

مچھیروں اور ملاحوں کے
آبائی گھروں پر مشتمل
اوجھل ہوئی
بستی میں جانا تھا

بُجھی مشعل
سیہ آندھی
مسافت
اور
اندھیر اور اندھیرا کرتے تھے پیچھا
مگرمچھ
اک صدا دیتے

نہیں ممکن کہ
مانجھی سے
ستارہ دوستی کرلے

تنویر قاضی

# دعاوں سے ہاری ہوئی ماں

دعاوں سے ہاری ہوئی ماں
تکیہ پہ سر ڈال کر تھک کر چور ہو کر عقل بجھا کر
نیند آجانے کی طلب میں آخر سو جاتی ہے
صبح اٹھتی ہے
آنکھوں کانوں سانسوں کے رستے
وہی درد وخطر لے کر
صحن میں جھاڑو دے کر امید نو کا رستہ
سنوارتی ہے
اس رستے پہ دعاوں کی پتیاں گراتی ہے
دلائل کی میز پہ مسکراتی عزت بچاتی پھر
سے آجاتی ہے
مگر
دورِ جدید اچانک جدید تر ہو گیا ہے
دورِ جدید کے مسائل جدا ہیں
نفسیاتی ترقیاتی مابعدالطبیعیاتی
ماضی کی ڈگری یافتہ کو سمجھ نہیں آتی
بس ہنستی ہے سینے سے لگاتی ہے یقین دلاتی ہے
سنو بیٹی
تمھیں جھکنے نہیں دوں گی
تمھیں آگے بڑھنے سے
کبھی رکنے نہیں دوں گی
کبھی رونے نہیں دوں گی
چھلکنے نہیں دوں گی
بس رک کر ٹھہر کر بچے
میری بات سن لو تم
کسی کو معاف کر دینا
کسی کو موقع دینا
غلطی تسلیم کر لینا
مفاہمت تقسیم کر دینا
کوئی کانٹا چبھ جائے

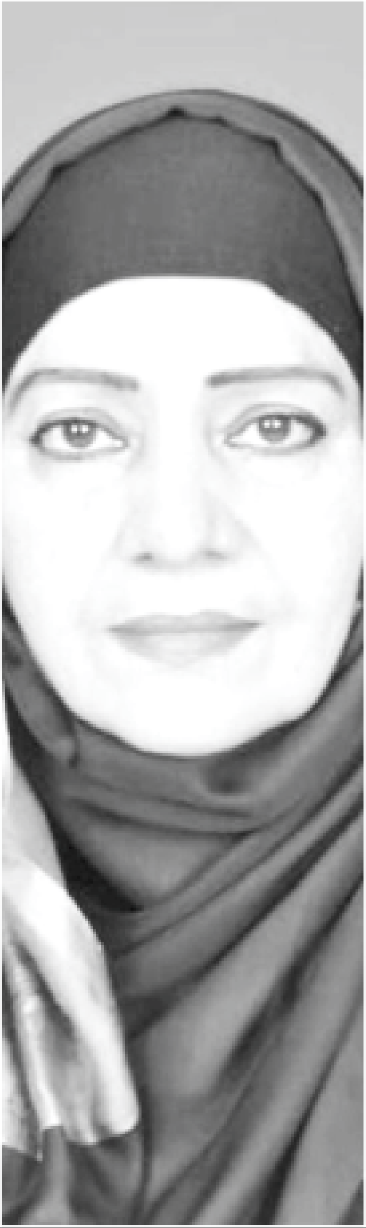

دردانہ نوشین خان

ذرا اختلاف ہو جائے
کوئی طعنہ دے جائے
اونچی بات کر جائے
نظر انداز کر کے بھی نظر بلند تم رکھنا
سمجھ لینا سمجھا لینا
اللہ ضامن بنا لینا
اللہ کے بعد رسولؐ جانم
علی جانم فاطمہ جانم
عمل چھوٹا نہیں ہوتا
ان کو خوش کرنے کا
عادل جب تولتا ہے
اجر لاحد ہوتا ہے
خدا شاداب رکھے
سدا گلاب رکھے
میری لاڈو میری چندا
دل جانی جگر جانی
کبھی کمزور نہ ہو تو
تری پرواز نہ ہارے

# اپنے ''ریاظ'' کے لیے

رنگ برنگی قوسیں، دائرے
اور لکیریں کھینچنے والے یار
چاہت بھری مسافت کا
عنوان ہو تم ۔۔۔۔۔
راحت اور تسکین بھرے
جیون کا سامان ہو تم
''ب'' برش کو لہراتے، بہلاتے آخر
''ظ'' ظرف کی گہرائی
تک آ پہنچے ہو
رنگ اچھالتی پوروں سے جب
سوچوں کے امکان سے یکدم
کینوس کی تہہ میں اترو تو
بھولے سے بھی
دھیان کے دروازے کو
بند نہ کرنا تم
ایسا نہ ہو،
واپسی کا رستہ کھو جائے
کینوس کے باطن میں اترنا
ہر اک کو انعام کہاں ہوتا ہے
نیلے، پیلے، سرخ، عنابی
جتنے رنگ بناؤ
جیسی بھی اسٹروک لگاؤ
ہر اک سے تسکین اٹھاؤ
اپنے فن کو خوب مہکاؤ
نئی شان سے جیتے جاؤ

**راجا نیرّ**

## دروازے سے لاتعلق دستک

اپنے ہی گھر میں اجنبی ہوں
اپنے ہی رشتوں سے
ناآشنا ہوتا جا رہا ہوں
آنکھوں کے آئینوں میں
دھند کا ڈیرہ ہے
گفتگو صرف دیواروں سے ہو رہی ہے
بس اپنے کمرے سے آشنائی رہ گئی ہے
کبھی کبھی میں اور کتابیں ہمکلام ہو جاتے ہیں
قلم میری باتیں مانتا ہے
لکھ لیتا ہے لکھ دیتا ہے
کھلونوں سے کھیلنے والے
میرے ناصح بنتے جا رہے ہیں
میری شناخت کی
آنکھیں اندھی ہو رہی ہیں
روح سے جسموں تک کا ملاپ رکھنے والے
فاصلوں کو ترتیب دینے پر تلے ہوئے ہیں
دیمک کی طرح
دلوں، دماغوں سے
ہر رشتہ کھایا جا رہا ہے
دروازے کا دستک سے تعلق
لاتعلق ہوتا جا رہا ہے
سبزی کاٹنے والی چھریاں
جسموں کو ٹکڑوں میں بانٹنے کی
ضد پر اُتری جا رہی ہیں
سائیوں سے پہچانے والے
حقیقت سے افسانہ بن رہے ہیں
ہر رشتہ
مٹھی سے گری ہوئی ریت کی طرح
کم ہو کے گم ہو رہا ہے
خود غرض ہوائیں
رشتوں کی ریت اڑانے پر تلی ہوئی ہیں
ہر تعلق کھا رہی ہیں
جسموں کو بے چہرہ بنا رہی ہیں
شناختوں کو اُلجھا رہی ہیں

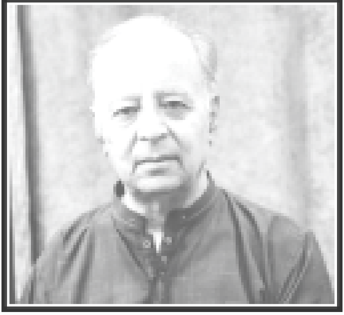

**سمیع اللہ عرفی**

# بے اماں اور بے سکون......

ہمیں معلوم ہے ہم نے
کسی کے ہجر میں یہ زندگی کیسے گزاری ہے
ہر اک خوشبو کی آہٹ پر گماں اس کا گزرتا تھا
ہر اک ساعت پہ دل بے تاب سینے میں دھڑکتا تھا
مگر
نہ سنتا ہے صداؤں کے دھڑکنے کی
نہ مجھ کو یاد رکھتا ہے نہ وہ مجھ کو بھلاتا ہے
وہ سارے خواب جو مدت ہوئی آنکھوں میں سو گئے تھے
انھیں پھر سے جگاتا ہے
جو مجھ سے چھین لیتا ہے میری خوشبو کی ہر ساعت
مجھے ہر پل رلاتا ہے
مگر جو ہجر لاحق ہے ہمیں
وہ جسم و جاں کے جو درمیاں دیوار ہے اک ان دیکھی
اسی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں سے گراتا ہے
امید و بیم کی آنکھوں سے بینائی کے سارے منظروں کو
خاک کرتا ہے مٹاتا ہے
سو ہم بھی خاک ہیں اور خاک کی تقدیر میں
لکھا گیا ہے ازل سے
"بے اماں او بے سکوں رہنا"......

محمد اشفاق بیگ

## لفظوں کے اپنے چہرے ہیں (نثری نظم)

ذرا شکلیں دیکھو
مجھے تو ہر لفظ کی بناوٹ بھلی لگتی ہے
ٹیڑھی میڑھی، آڑی ترچھی
اچانک کوئی لکیر کہیں مڑ جاتی ہے
اور
ایک نقطے سے
لفظ کا مزاج بدل جاتا ہے

ہر لفظ کا اپنا ذائقہ ہے
میٹھا، نمکین، پھیکا
کچھ حروف کا اجتماع
کتنا گنجلک
سادہ
کچھ کی جڑیں
دوسری زبانوں کی مٹی میں پیوست
کسی نے سفر میں آواز بدلی
کسی نے لباس اور چہرہ
مگر پھر بھی
ہم انھیں سماعت کی کسوٹی سے
پرکھ لیتے ہیں

کچھ لفظ متروک
لغت کے پرانے صفحے پر
کھانستے رہتے ہیں
کچھ تازہ
تفہیم کے احاطے میں
ہمیں معانی سے آشنا کرتے ہیں
لفظ پتھر نہیں ہیں
کہ ایک جگہ
پہاڑ کی طرح کھڑے
ہمیں اجنبی ہونے کا احساس دلائیں
یہ موم کے بستر پر گرے
وہ شبنمی قطرے ہیں
جن سے وفاداری کی تشکیلِ نو ہوتی ہے

لفظ
بازار کی رونق
تنہائی میں
خود کلامی کا جوہر
فضا کا قدیمی حسن ہے
جسے
کبھی ماں کی آواز میسر آتی ہے
کبھی شرارتی لہجے کی غنائیت
اور
کبھی ایک طویل خاموشی
جہاں سانس کی بازگشت سنائی دیتی ہے

امجد بابر

# یہاں میں نہیں ہوں

یہاں میں نہیں ہوں
مجھے گھر سے نکلے ہوئے اک زمانہ ہوا ہے
کئی سال گزرے
مجھے دامنِ کوہ سے چند مانوس قدموں
کی آواز آئی
پراسرار آبادیوں کے کسی گھر میں
کانوں نے
اک عنبریں ہاتھ کی کوئی مالوف دستک سنی تھی
مگر دوسری شب مجھے اپنے خوں گشتہ
پاؤں کسی رہ گزر پر ملے تھے
مگر ہونٹ میرے سلے تھے
(حسینانِ عنبر ذوائب سے دوری میں
انسانیت کی بقا ہے)
بندھا ہوں یہیں پر
وہ آواز سن کر بھی اپنے دکھوں کے
طویلے سے نکلا نہیں ہوں
یہاں میں نہیں ہوں
مجھے گھر سے نکلے ہوئے اک زمانہ ہوا ہے

مجھے جانتے ہو؟
ابھی تک یہیں ہوں
میں بازارِ تہذیب کا معجزہ ہوں
مرے زم زموں میں کہیں رنگ
و آہنگ بھی آ گئے ہیں
مرے سر پہ بے مہر اور بے مراد آسماں ہے
کہ پیروں تلے اک ستم گر زمیں ہے
زمیں بھی کہیں ہے؟

ہمہ مقدر ہستیاں میرے مدمقابل
قلعہ بندیوں میں الجھنے لگی ہیں
(تمھیں کیوں دکھائی نہیں دے رہی ہیں)
ابھی تک یہیں ہوں
مگر میں نہیں ہوں
کہیں گم شدہ بستیوں کے فسوں ساز
رستوں میں
اک نقرئی اسپِ تازہ پہ بیٹھا ہوا میں
سحر اور افسوں کے سب ضابطے
ڈھونڈتا ہوں
تھکے ماندے عیاش لوگوں کے جیون
میں پھیلی کراہت زدہ
دوستی اور محبت کی معصومیت سے بھری

محمد افتخار شفیع

زندگی کے حسیں رابطے ڈھونڈتا ہوں
اور اس غم کدے میں
مرے غم کی ماری
وہ کندن کنواری
وہ ناری اور اس کے حسیں رس بھرے ہونٹ
میں جن کی خاطر کئی سال مر مر کے
جیتا رہا ہوں
انھی سرخ ہونٹوں کے رس کو برس
ہا برس
جشنِ نوروز پر ایک ٹانک کی صورت
میں پیتا رہا ہوں

کہاں ہے وہ ناری، مرے غم کی ماری
میں کڑیل جوان اور وہ کندن کنواری
میں کندن کنواری کے حسنِ گراں
مایہ کی دعوتِ بے بہا پر بھی
اپنے غموں کے جھمیلے سے نکلا نہیں ہوں
یہاں میں نہیں ہوں
مجھے گھر سے نکلے ہوئے اک زمانہ ہوا ہے

# رنگ عالم

خالق کون و مکاں قادر ہر پست و بلند
تیری دنیا کو بہت غور سے دیکھا میں نے
برق وطوفاں کی جبینوں کے پسینے دیکھے
خس و خاشاک کی نبضوں کو ٹٹولا میں نے

ریشۂ گل سے ٹپکتا ہوا خوں دیکھا ہے
سانس لیتے ہوئے ذروں کی سُنی ہے آواز
لالہ وگل کی جو شاخوں میں لچکتے دیکھا
دشت وکُہسار کی بانہوں میں بھی پایا ہے گداز

مسجدوں، مندروں، گرجاؤں، کلیساؤں میں
نور ایماں کے اجالوں میں اندھیرے دیکھے
مولوی، پادری، پنڈت کے حسیں روپوں میں
ظالم و جابر و سفاک لُٹیرے دیکھے

جگمگاتے ہوئے شہروں کے گلی کوچوں میں
کتنی تہذیب کی سڑتی ہوئی لاشیں دیکھیں
کتنے تابندہ و مہتاب نُما ہاتھوں پر!
غم و اندوہ کی پُرسوز خراشیں دیکھیں

کتنی آنکھوں میں غم زیست کی تلخی پائی
کتنے سینوں میں تمناؤں کے مدفن دیکھے
آل نمرود کی پھیلائی ہوئی آتش میں
کتنے اولاد براہیم کے گلشن دیکھے

میں نے گردانے ہیں اوراق کتاب عالم
مُجھ کو معلوم ہے دُنیا کی حقیقت کیا ہے
میرے ہر اشک نے کھائے ہیں تبسم کے فریب
میں سمجھتا ہوں کہ انجام مُسرت کیا ہے

جو خیالات کی پستی میں بھی ڈھونڈے نہ ملے
اے خُدا تیری خُدائی میں وہ پایا میں نے
خالق کون و مکاں، مالک ہر پست و بلند
تیری دُنیا کو بہت غور سے دیکھا میں نے

انوار انجم

# سحر--اک نئی روشنی کی علامت

کل شب
چاند بادل کی اوٹ
میں درد چھپائے بیٹھا تھا۔

میں اسے پل بھر تکتا رہا،
کبھی دودِ ابر
روئی کے گالوں کی مانند
اڑتے، بھاگتے دیکھے،
کبھی رات کی سیاہی
منظر سے اسے
غائب کر دیتی۔

تمنا، خواہش، آرزو، جستجو
اپنا اپنا حصار لیے ہوئے
میرے اردگرد
اک نیا راگ
الاپنے لگیں۔

میں نے کتابِ زندگی بند کی،
جسم کو اک جھٹکے سے
لادے ہوئے بوجھ سے آزاد کیا،
اور خود سے مخاطب ہوا:

سحر،
اک نئی روشنی کی علامت ہے
اک نئی روشنی کی علامت ہے

شبیر آکاش

# "گونگے سناٹوں کا شور" [نثری نظم]

سنا ہے شہر میں ایک وائرس پھیل رہا ہے
لوگ ایک دوسرے کی پہچان بھولنے لگے ہیں
آنکھیں دیکھنے کے باوصف بھی دیکھ
نہیں پاتیں
سماعتیں محروم سماعت ہیں
گونگے سناٹے ہر سو شور مچاتے پھرتے ہیں
لوگ اک دوسرے سے کترانے لگے ہیں
نادیدہ تعفن سے فضا
اتنی آلودہ ہو چکی ہے کہ
سانس لینا دوبھر ہوا جاتا ہے
کتوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے
تا کہ پاگل پن کی شرح روکی جا سکے
ویرانی گھروں پر دستک دینے لگی ہے
الوؤں کو شہر میں بسیرا کرتے دیکھا گیا ہے
چاند کو فضا کی کثافتوں نے کب کا
نگل لیا ہے
دھوپ کی ٹھنڈک رگوں کو منجمد کرنے کو ہے
سورج نے تپش بیچ ڈالی ہے
خواب دیکھنا اب جرم ٹھہرا ہے
مصنوعی تنفس سے سانس لیتی زندگی
وینٹی لیٹر پر ذہن کی موت کی منتظر ہے
تا کہ مردہ روح کی
آخری رسومات ادا کی جا سکیں
خلوص اور محبت کی قبر تیار ہے
اور وجود مدفن میں اترنے کا منتظر
گدھ بھی اب مردہ گوشت نہیں کھاتے

**نائلہ راٹھور**

# خیالات کی قید (نثری نظم)

کتنا عجیب ہے یہ انسان بھی،
ہزاروں راستے بدل لیتا ہے،
شہر چھوڑ دیتا ہے،
رشتے توڑ دیتا ہے،
مگر اپنے ہی خیالات سے
کبھی جدا نہیں ہو پاتا۔

کچھ خیال
خاموشی میں چیختے ہیں،
کچھ یادیں
آنکھوں سے برس جاتی ہیں،
اور کچھ درد
مسکراہٹ کے پیچھے
زندہ رہتے ہیں۔

لوگ سمجھتے ہیں
وقت زخم بھر دیتا ہے،
مگر وہ نہیں جانتے
وقت صرف کیلنڈر بدلتا ہے،
کچھ خیال عمر بھر
دل کی دیواروں پر لکھے رہتے ہیں۔

پھر ایک دن
انسان سیکھ لیتا ہے
خیالات سے بھاگنا نہیں،
ان کے ساتھ جینا ...
کیونکہ سب سے بڑی جنگ
دوسروں سے نہیں،
اپنے اندر کے شور سے ہوتی ہے۔

کومل شہزادی

# میں اُترنا چاہتا ہوں

کتنی تیز اور بے ہنگم سی آوازیں ہیں
کتنا شور ہے
ہمسفروں کی بے مفہوم صداؤں کا
رنگ برنگی سیٹوں پر
کالے سرخ اور سفید سے چہروں والے
عقرب بن کر بیٹھے لوگوں سے ڈر لگتا ہے
انتشار کیوں ہے
آنے والا کوئی بھی لمحہ
کلک زماں سے
کاغذ جاں پر
کوئی بھی سانحہ لکھ سکتا ہے
دیکھو
آنکھ سے اوجھل ہونے والے
ہر منظر میں
کتنے چہرے آنکھ سے اوجھل ہو جاتے ہیں
کیا جلدی ہے
ایسے سفر کو جاری رکھنا
میرے بس کی بات نہیں
میں نہیں جاتا
ٹھہرو ٹھہرو۔۔۔۔ روکو اس کو
اب میں اترنا چاہتا ہوں
اس دنیا کی گاڑی سے

**ذہین احمد**

---

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

# دُعا (نثری نظم)

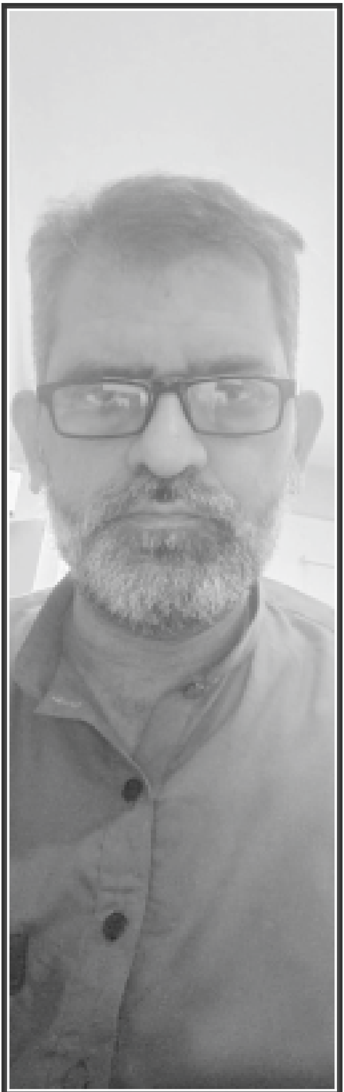

یا احسن الخالقین
اے مری تخلیق فرمانے والے
مجھے پرورش کر کے
سننے، دیکھنے، بولنے
اور سمجھنے کا شرف بخشنے والے
مری کم مائیگی
کہ بھول چکا
مرا بھی احتساب ہونا ہے
آج میں ساکت وجامد ہوں
بخش دے مری ساری خطائیں اے خالق
توفیق عطا کر مجھے کہ غبار بن کے ہی
کارواں کے ساتھ تو چلوں
مرے باطن کو پاک کر
مجھے صف آرا کر
بے شک تُو ہی بدل سکتا ہے
اندھیرے کو اُجالے میں
اُس قرارِ جاں کے وسیلے سے
تسکینِ قلب عطا کر
رحم فرما
یا ارحم الراحمین

محمد عبداللہ

# سندیسہ

گلشن میں پھول

پھولوں میں رنگ

فلک پہ ستارے

ستاروں میں چمک

سب رنگ آج کھل اٹھے

سب پھول آج محوِ رقص ہیں

کیونکہ

آج ہی تمھارا فون آیا ہے

اور

تم نے یہ سندیسہ دیا ہے

کہ میں تمھارا ہوں

صرف اور صرف تمھارا

**نگہت اکرم**

انتخاب

**- خالد احمد -**

نعمان منظور

رگ رگ ایک تصور ایک امنگ بھرے
اک خوشبو پھولوں میں کیا کیا رنگ بھرے

رات چراغ ہوا اور میں
شعری مجموعہ
سکندر بیگ مرزا

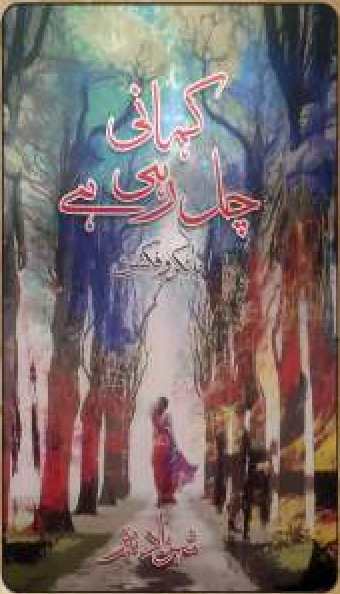
کہانی
چل رہی ہے

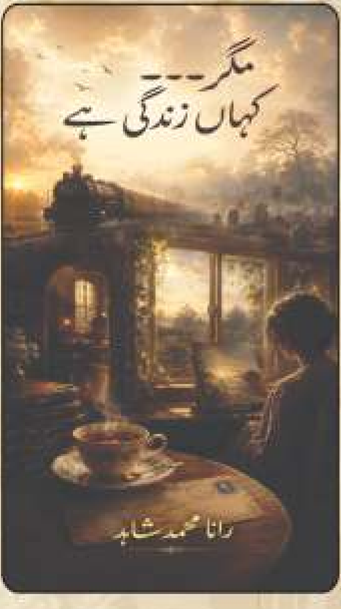
مگر---
کہاں زندگی ہے
رانا محمد شاہد

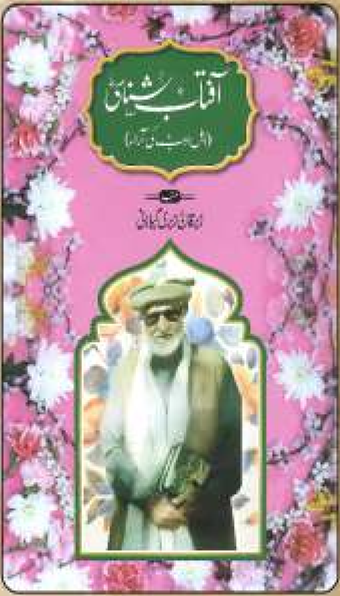
آفتاب شناس

جناب خالد احمد صاحب شیزان لاہور میں منعقدہ تقریب "بیادِ یزدانی جالندھری"
میں مضمون پیش کر رہے ہیں۔ سٹیج پر جناب حفیظ تائب اور حامد یزدانی بیٹھے ہیں۔
نوے کی دہائی سے ایک یادگار تصویر

جناب احمد ندیم قاسمی، محترمہ منصورہ احمد، منظر حسین اختر، جناب اسد احسان،
جناب عبدالغفار، جناب نجیب احمد، جناب خالد احمد